ہفت روزہ

ندائے خلافت

۷ رجون ۱۹۹۳ء

☆ مسلمانوں کے خلاف مغرب کی کامیاب منصوبہ بندی

☆ وزارتی مشن کے دو اراکین کی گاندھی سے سازباز تھی

☆ ہمیں آزاد معاشرہ درکار ہے "مادرپدر آزاد" معاشرہ نہیں

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے　　وہ دل' وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج　　یہ سب باقی ہیں' تو باقی نہیں ہے

امت مسلمہ نے انہی دنوں دو عظیم دن منائے ہیں' یوم عرفہ اور یوم نحر جن میں سے پہلا تو صرف ان خوش نصیبوں کو میسر ہوا جو ۹ ذی الحج کو حالت احرام میں بہ آواز بلند "لبیک' اللھم لبیک" کا ورد کرتے ہوئے وقت مقررہ کے اندر اندر میدان عرفات میں پہنچ گئے البتہ دوسرا پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے عیدالاضحیٰ کی شکل میں عام ہے جسے وہ اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے جانوروں کی قربانی دے کر "ذبح عظیم" کی سالانہ یادگار بنا دیتے ہیں۔ حج اور عیدالاضحیٰ دونوں ہی اللہ کے برگزیدہ بندے ابراہیم (علیٰ نبینا و علیہ السلام) کی زندگی کے ان پہلوؤں کا عکس ہیں جنہیں ہمیشہ روشن رکھنا مقصود ہے۔ وہ امام الناس ہیں' ابوالانبیاء ہیں اور خلیل اللہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی ابتلاء و آزمائش میں سے گزرتے ہوئے بسر کی۔ ایسے ایسے امتحان انہوں نے پاس کئے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ فیصلہ کن تھا اور ایک پر تو خود ممتحن کو تسلیم کرنا پڑا کہ آزمائش واقعی بہت کڑی تھی۔

حج مسلمانوں کے لئے ایک جامع انفرادی عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کی اجتماعیت کی ایک شاندار علامت بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے بہت سے شعائر اللہ کی طرح اس کی بھی ہم صرف رسم برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ہماری دوسری عبادات کی طرح روح سے خالی ہے ____ رہ گئی رسم اذاں' روح بلالی نہ رہی ____ عیدالاضحیٰ کے موقع پر ایام تشریق میں ہم نے اپنے جدا امجد جناب ابراہیمؑ کی سنت کا اتباع کرتے ہوئے جانوروں کی قربانی دی ہے لیکن کتنے ہوں گے جنہیں یاد رہا ہو کہ ان جانوروں کا گوشت اور خون اللہ کی جناب میں نہیں پہنچتا' وہاں تو صرف تقویٰ مقبول ہو گا جو مرضی رب کے مقابلے میں دوسری ہر مصلحت کو قربان کر دینے کا نام ہے' ہر خواہش نفس کو ذبح کر دینے سے عبارت ہے۔○○

قیمت ۵ روپے

جناب نعیم صدیقی کا ایک کالم

دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

حکیم روح پرور و(؟) ایمان انگیز کا ایک شعر ہے جسے میں اپنا کر لکھ رہا ہوں؟

دربیاباں مثل چوبے نیم سوز
کارواں بگذشت ومن سوزم ہنوز

آج کا فارسی کا شعر ایسا ہی ہوگیا ہے' جیسے ترکی زبان کی کوئی سطر۔ سو ترجمہ کئے بغیر چارہ نہیں۔ ترجمہ یہ ہے کہ ایک ایسا بیاباں جسے کارواں چھوڑ کر آگے چلا گیا ہے' اس میں ادھ جلی لکڑی کی طرح ابھی تک جل رہا ہوں' بغیر شعلے کے سلگ رہا ہوں' صحرا میں رات گزار کر چلے جانے والے کاروانوں کے بعد نقشہ یہی ہوتا ہے کہ ع

ٹوٹی ہوئی طناب ادھر' آگ بجھی ہوئی ادھر

مگر بجھی ہوئی آگ کے مقام پر ادھ جلی لکڑیاں سلگتی ہوئی' سنے کاروانوں کا انتظار کرتی ہیں جن کے دم سے پوری طرح جل کر قربان ہونے کا لطف مل سکے گا۔ اردو میں ایک اور مصرع اس سلگتی لکڑی کا عکاس ہے' ملاحظہ ہو

گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

ہمارا کارواں جاچکا ہے' پیچھے کچھ ہماری طرح کی سلگتی لکڑیاں رہ گئی ہیں' یعنی منھم من قضیٰ نحبہ و منھم من ینتظر یہ "ینتظر" والے لوگ بہت اجنبی بن کے رہ جاتے ہیں بلکہ رہ گئے ہیں۔ ذرا کچھ اشارے ملاحظہ ہوں:

ایک جوان عزیز نے کہا کہ تم تو بڑے اچھے اور سمجھ دار آدمی تھے' تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیا کہتا؟ یہی کہ سرسام ہوگیا ہے اگرچہ آج کل فیشن کینسر کا ہے۔ دل میں' میں نے کہا' کتنے پکے ایمان کا آدمی ہے' کتنا زاہد و متقی اور کتنا صاحب بصیرت و شعور ہے کہ اگر کوئی خادم اسلام' اسلام کا مسئلہ بھی کردے تو یہ پھر بھی خادم اسلام پر جان نچھاور کرے گا مگر مجھے پہچانتا نہیں ہے' اگرچہ مدت سے جانتا ہے۔

ایک اور شریف و متین عزیز ہیں' انہوں نے برسوں عزت کی مگر اب کہتے ہیں کہ اس شخص پر (یعنی مجھ پر) کوئی دباؤ ہے' جی ہاں! امریکہ کے ڈالر کا دباؤ ہوگا' کسی سیاسی لیڈر کا دباؤ ہوگا' سندھ کے کسی وڈیرے یا ڈاکو کا دباؤ ہوگا' ورنہ کم سے کم کسی آسیب کا دباؤ تو ہو ہی سکتا ہے۔ ان عزیز نے میری ساری گزشتہ زندگی شاید دیکھی نہیں اور اس میں کبھی دباؤ دریافت نہیں کئے۔

ایک شریف آدمی کہتا ہے' شاید دماغ ٹھیک نہیں کام کررہا۔ جی ہاں پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں' کبھی ریت کو چینی سمجھ لیتا ہوں' کبھی گھوڑا مچھر کی شکل میں دیکھائی دیتا ہے' شاید جلد ہی رشید چودھری صاحب کے فاؤنٹین ہاؤس میں داخلہ لینا پڑے۔ ان صاحب نے شاید نہ کبھی میری نثر پڑھی' نہ نظم دیکھی' مگر تشخیص امراض دماغی کے ماہر کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ شاید کلینک بھی کھول لیں خوب کہا مرشد اقبال نے۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے' مسلمان ہوں میں

مسٹر سہیل وڑائچ مشہور اخباری رپورٹر فرفیسر آبزرور میں جلوہ گر ہوتے ہیں' وہ ہمیں "اولڈ گارڈ" کا ہوائی ٹکٹ عطا کرچکے ہیں اور ---- ہم دونوں اس کے منتظر ہیں کہ کب عالم آخرت کو جانے والا "سی ۱۳۰" ہمارے لئے آتا ہے اور کب ہم روانہ ہوتے ہیں' مگر یہ مشکل کیسے حل ہوگی کہ خدا بھی قدیم' رسول بھی پرانا' قرآن بھی پرانا' "اولڈ گارڈ" سبھی۔ وہ گارڈ بھی ہے اور اس کا ریکارڈ بھی لازم ہے' کوئی باڈی گارڈ اس سے کسی کو نہیں بچا سکتا۔

خیر جن صاحب نے ہمارے دماغ پر حرف رکھا تھا' ان کی بات بڑی قابل توجہ نظر آئی۔ ان کی طرف روئے سخن کرکے ہم نے کہا کہ اگر ہم تھوڑے بہت جنونی نہ ہوتے تو اس راستے پر آتے ہی کیوں' جس پر چلتے ہوئے کبھی گالیاں کھائیں' کبھی کفر کے فتوے لگے' کبھی ہمیں ایسے فاقہ مستی کے دن بھی پیش آئے کہ شام تک آٹا منگانا ہے اور ایک روپیہ موجود نہیں' کبھی یہ خستہ حالی کہ ضروری خط لکھتے ہیں اور ٹکٹ لگانے کے لئے پیسے نہیں' کبھی یہ ایڈونچر کہ ہم ایک مشہور پی ایس سے ملنے چلے تو گھر والوں سے پوچھا کچھ کرایہ وغیرہ کے پیسے ہوں گے' معلوم ہوا صرف ایک آنہ یا اکنی گھر میں ہے۔ ہم نے کہا لائیے' سستا زمانہ تھا' اومنی بس ایک آنے میں گنگا رام اسپتال تک لے گئی' وہاں سے آدھا میل پیدل چل کر ہوٹل شیزان پہنچے' جہاں مدعو کئے گئے تھے۔ اندر جاکر صوفے قالینوں کا لطف اٹھایا اور اپنی اکنی یاد آتی رہی۔ واپسی کے لئے کوئی اور حل نکالا' اکنی اس لئے یاد رہی کہ "اے ایاز! آں پوستیں را یاد دار" یعنی اے ایاز! تو بادشاہ کا چہیتا بن گیا ہے' مگر یہ نہ بھولنا کہ تو دراصل گدریا تھا اور اس زمانے کی پوستین تو نے صندوق میں اسی یادداشت کے لئے چھپا رکھی ہے' تو وہ اکنی ہمیں کبھی فراموش نہ ہوئی۔

اور یہی ہمارا پاگل پن کام آیا' جب سید شفقت شاہ صاحب نے اسمال اسکیل انڈسٹریز کے دور میں آفر

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

جناب نعیم صدیقی جماعت اسلامی کے اکابرین میں شامل ہیں اور جماعت کے ادبی محاذ کے تو کمان دار رہے ہیں۔ صحافت کے میدان میں بھی انہوں نے متعدد معرکے سر کئے اور جماعت کے لٹریچر میں ان کے علمی کام کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ وابستہ تو تاحال وہ اسی شجر سے ہیں لیکن غالباً امید بہار اس کبر سنی میں ان سے روٹھ گئی ہے کیونکہ جماعت کی حالیہ مہمات کے ساتھ وہ باوجود ہزار کوشش کے ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکے۔ مؤقر معاصر ہفت روزہ تکبیر کراچی میں ان کا ایک کالم ہم یہاں من و عن نقل کر رہے ہیں اور یہ ان کی طرف سے پہلی صدائے احتجاج نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی جماعت مشورے اور نصیحت سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ اب ضرورت دوا سے زیادہ دعا کی ہے۔ نعیم صدیقی صاحب دعا فرمائیں' ہم بھی دعا کرتے ہیں۔

تکبیر کے قارئین میں کتنے ہوں گے جنہوں نے نعیم صدیقی صاحب کے درد کو جانا ہو لیکن ہم نے ان کی تحریر کو ایک "کالم" نہیں سمجھا بقول اقبال یہ سمجھتے ہوئے پڑھا ہے کہ ____ دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے ____ مدیر

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

جلد ۲ شمارہ ۲۲

۷ رجون ۱۹۹۳ء

9

مدیر

اقتدار احمد

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مقام اشاعت

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۸۵۶۰۰۳

○

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری

مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

○

قیمت فی پرچہ: ۵/- روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۰۰/- روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۰ امریکی ڈالر

مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۸ " "

افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۲ " "

شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۱۲ " "

الجزائر اور پاکستان --------- زمین و آسمان کا فرق ہے

پاکستان اسلامی محاذ یا پاکستان اسلامک فرنٹ کے نام سے جماعت اسلامی نے اگلے عام انتخابات کے لئے نئے اصولوں اور نئے قواعد و ضوابط کے تحت جو نئی صف بندی کی ہے اس پر متعدد تبصرے سامنے آچکے ہیں۔ تقریباً سبھی مبصرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ امیر جماعت اسلامی جناب قاضی حسین احمد اور جماعت کی نوجوان قیادت نے الجزائر کے اسلامک سالویشن فرنٹ (ایف آئی ایس) کی حکمت عملی کو اپنایا ہے جس کی انتخابی کامیابی کو آخری مرحلے میں فوج کی جارحانہ مداخلت نے خاک میں نہ ملادیا ہوتا تو پالا مار ہی لیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس تبصرے کے ساتھ سب لوگوں نے الجزائر اور پاکستان کے معروضی حالات میں پائے جانے والے فرق و تفاوت پر بھی اپنی رائے دی ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ اس سلسلے میں جو بات امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے خطاب جمعہ میں فرمائی وہ اتنی ہی سچی ہے جتنی دوسرے تجزیوں میں نظرانداز کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ الجزائر کی صورت حال میں جن دو عوامل کا کہیں ذکر نہیں آیا' وہی انتخابی عمل میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں اور بالخصوص پاکستان میں ان کی طرف سے آنکھیں بند کرکے جو منصوبہ بندی کی جائے گی اس کی حیثیت کسی حسین خواب سے زیادہ نہ ہوگی۔ پہلا یہ کہ دوسرے عرب ممالک کی طرح الجزائر میں بھی فرقہ واریت موجود نہیں۔ سیاسی میدان میں تو کیا' مسلکی اختلافات کو وہاں سماجی زندگی میں بھی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور دوسرا یہ کہ الجزائر میں جاگیرداری اور بڑی زمینداریوں کا وجود ہی نہیں کیونکہ اس نعمت سے تو فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد قائم ہونے والی مسلمان سوشلسٹ حکومت نے ہی قوم کو نجات دلادی تھی اور اس عفریت کی تدفین پر اب چوتھائی صدی بیت چکی ہے۔

اہل نظر خود ہی دیکھ لیں کہ ان دو موٹی موٹی باتوں نے الجزائر اور پاکستان کی انتخابی فضا میں کیسا زمین آسمان کا فرق پیدا کردیا ہے اور وہاں کے نتائج پر قیاس کرکے یہاں اپنی حکمت عملی وضع کرنے والے ہمارے بھائی دھوکہ کھا رہے ہیں' چاہے کتنے ہی خلوص و اخلاص کے ساتھ کھا رہے ہوں۔

ایک بات کی طرف وابستگان جماعت کی توجہ ہم بھی مبذول کرانا چاہیں گے اور چونکہ اس کا پورا فلسفہ ان پر اچھی طرح واضح ہے لہٰذا صرف اشارہ ہی کافی ہے۔ وہ ذرا غور فرمائیں کہ غلبہ دین کی جدوجہد سے ان کا مقصود حقیقی رضائے الٰہی کا حصول اور نجات اخروی ہے یا خود اس جدوجہد کی بالفعل کامیابی جسے یقینی بنانے کے لئے ذرائع کے جائز و ناجائز اور روا و ناروا کی تمیز برقرار رکھنا بھی ضروری نہ ہو۔ دیں ہاتھ سے دے کر دین کو جو "سرفرازی" حاصل ہوگی' اس سے مسلمانوں کی اجتماعیت کا بھلا ہوگا نہ افراد کی عاقبت سنورے گی اور یہ حقیقت تو ہر وقت ذہن میں مستحضر رہنی چاہئے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے فرداً فرداً پیش ہونا ہوگا ----- ○○

معاونین تحریک خلافت توجہ فرمائیں!

"ندائے خلافت" کا گذشتہ شمارہ (بابت ۲۴ / مئی ۹۳ء) تحریک خلافت کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک مفید ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے' اس لئے کہ اس میں نہ صرف تحریک خلافت کے پہلے سالانہ کنونشن کی رپورٹیں اور نوائے وقت میں شائع شدہ داعی تحریک کے مذاکرے کے حوالے سے تحریک خلافت اور اس کی دعوت کا ایک بھرپور تعارف موجود ہے بلکہ حالیہ محاضرات قرآنی کی جامع رپورٹ کے ذریعے سے منہج انقلاب نبویؐ کی بھی عمدگی سے وضاحت ہوجاتی ہے۔ آپ اس شمارے کو خود بھی توجہ سے پڑھئے اور اپنے حلقہ احباب تک بھی پہنچائیے!

ہمیں چونکہ اس شمارے کو ازسرنو طبع کرانا ہوگا لہٰذا مناسب ہوگا کہ پاکستان کے مختلف شہروں میں قائم خلافت کمیٹیوں کے ارکان ہمیں مطلوبہ تعداد سے مطلع کریں تاکہ ہم اس کے مطابق اس شمارے کا دوسرا ایڈیشن طبع کرائیں۔ آپ حضرات کی طرف سے ڈیمانڈ ہمیں 15 جولائی تک وصول ہوجانی چاہئے ---- شکریہ

(ادارہ)

الہدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرہ

(آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

اور ہم لازماً تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور جان و مال ور ثمرات کے نقصان سے'

(ہجرت کے فوراً بعد مدینہ میں مسلمانوں کے ایک مرکز کے قیام اور امت کی تشکیل کے اعلان کے بعد جو اہم ابتدائی ہدایات مسلمانوں کو دی گئیں انہی میں یہ پیشگی تنبیہہ بھی شامل ہے کہ یہ خیال اگر کسی کے ذہن میں موجودہ ہے کہ ایمان لانے اور امت مسلمہ میں شامل ہونے کے نتیجے میں جس راہ کو اس نے اختیار کیا ہے اس میں کوئی کانٹا بھی پیر میں چبھنے نہ پائے گا اور یونہی سیج سیج جنت تک رسائی ہو جائے گی' تو وہ اس غلط فہمی کی اصلاح کرلے-- اس راہ میں تو قدم قدم پر امتحانات و مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا اور خوب ٹھوک بجا کر دیکھا جائے گا کہ ایمان میں کھوٹ کی آمیزش تو نہیں ہے-- بھوک اور خوف سے دوچار کر کے بھی ایمان کی جانچ پرکھ کی جائے گی اور جان و مال کے زیاں سے بھی امتحان کیا جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نتائج و ثمرات کے نقصان کے ذریعے بھی اہل ایمان کو آزمائش سے گزارا جائے گا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دین کے غلبہ و نفاذ کے لئے کی جانے والی صبح و شام کی محنتیں کسی غلط حکمت عملی کے باعث یا کسی اور سبب سے غارت ہو جاتی ہیں اور امیدوں اور آرزوؤں کی فصل جب پکنے کو تیار ہوتی ہے تو کوئی ناگہانی آفت اسے تباہ و برباد کر ڈالتی ہے-- بلاشبہ یہ سخت ترین امتحان ہے اور اہل ایمان کو اس دنیا میں اس امتحان سے بھی سابقہ پیش آتا ہے)-

اور بشارت دے دو صبر کرنے والوں کو ○ کہ جن کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے ہیں اور یقیناً اسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں ○

(ان تمام امتحانات میں ثابت قدم رہنے والوں اور ہر حال میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے والوں کے لئے تہنیت و مبارک باد ہے- یہ وہ حقیقت شناس لوگ ہیں جو کسی مشکل اور تکلیف میں نالہ و شیون نہیں کرتے بلکہ ایسے مواقع پر ان کے لبوں پر یہ مبارک الفاظ جاری ہو جاتے ہیں کہ "اناللہ وانا الیہ راجعون" __ کہ ہمارا تو وجود ہی اللہ تعالیٰ کا رہین منت ہے' اسی نے ہمیں خلعت وجود بخشا ہے اور شرف انسانیت سے سرفراز فرمایا ہے اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے- تو اس چند روزہ زندگی میں جو درحقیقت امتحانی وقفہ ہے' اگر ہمیں اپنے خالق و مالک کی طرف سے ڈالے گئے کسی امتحان کے نتیجے میں کوئی تکلیف یا مصیبت پہنچتی ہے تو شکوہ و شکایت کا کیا مقام کہ ہر کہ ساقی ما ریخت عین الطاف است)

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت ہے' اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں ○

(صحیح اور سیدھی راہ پر گامزن یہی لوگ ہیں- اور یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے طرز عمل اور اپنی قربانیوں کے نتیجے میں پروردگار کی عنایات اور اس کی رحمتوں کے حق دار و سزاوار ہیں اور فی الواقع قابل رشک لوگ بھی یہی ہیں)

قائداعظم نے اپنی کونسل کو مشورہ دیا کہ کیبنٹ مشن پلان قبول کرلیا جائے

(چھٹی قسط)

مسلم قیادت کو چومکھی لڑائی لڑنی پڑی

وزارتی مشن کے تین میں سے دو اراکین کی گاندھی سے ساز باز تھی

مرزا ایوب بیگ

کیبنٹ مشن پلان پر قائداعظم کا ردعمل محتاط لیکن مثبت تھا جبکہ گاندھی کے قانونی ذہن نے پلان کے اہم ترین نکات کی اپنی تعبیر کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا اگلے ہی روز (یکم مئی ۴۶ء) کو ان کا اپنے اخبار ہریجن میں ایک بیان شائع ہوا جس میں انہوں نے کہا کہ "مشن اور وائسرائے نے فریقین کے مابین مفاہمت کی پوری کوشش کی لیکن وہ کوئی تصفیہ نہ کروا سکے' چنانچہ انہوں نے ملک کے لئے وہ سفارشات دی ہیں جو ان کے خیال میں آئین ساز اسمبلی کو قبول ہوں گی۔ یہ ادارہ یعنی آئین ساز اسمبلی ان سفارشات میں ترمیم کرنے یا ان کو رد کرنے یا ان میں اصلاح کرنے کا مجاز ہو گا۔ ان کی سفارشات قبول کرو یا رد کرو کے زمرے میں نہیں آتیں کیونکہ اگر قدغنیں نگائی گئیں تو آئین ساز اسمبلی کو ہندوستان کی آزادی کا آئین آزادنہ طور وضع کرنے کے لئے ایک خود مختار ادارہ کی حیثیت حاصل نہ ہو گی' مثلاً مرکز کے شعبوں میں اضافہ یا کمی کی جا سکتی ہے۔ اسمبلی کو اختیار ہو گا کہ مسلم اور غیر مسلم کی اس تفریق کو جسے مشن نے مجبوراً تسلیم کیا' کا خاتمہ کر دے۔ یہی صورت صوبوں کی گروپنگ کی بھی ہو گی اور چاہے تو اسمبلی گروپنگ کو سرے سے ہی رد کر دے"۔ یعنی پلان میں جو باتیں ہندو مفاد کی ہیں مثلاً ہند کی وحدت اور مرکزی اسمبلی کا قیام وغیرہ' اسے تو جوں کا توں قبول کر لو لیکن جو مسلم مفاد کی ہوں' انہیں توڑ مروڑ لو اور اپنے مطلب کی تعبیر کر لو۔

یہاں ضمناً عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کیبنٹ مشن کے دو ارکان پیتھک لارنس اور کرپس جو گاندھی کے روحانی ہم مشرب تھے یا اس بہانے کانگرس اور گاندھی سے اندرون خانہ ساز باز کئے ہوئے تھے' گاندھی کی ان سیاسی قلابازیوں اور ہیر پھیر میں اس کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے جبکہ مشن کے تیسرے رکن وی وی الیگزنڈر اور وائسرے لارڈ ویول غیر جانبدار تھے۔ بعض دستاویزات سے ایسے ثبوت ملتے ہیں کہ اول الذکر دونوں اراکین گاندھی اور کانگرس کے دوسرے اراکین سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے جن کا علم وائسرائے اور مشن کے تیسرے رکن کو بھی نہ ہوتا۔ لیکن اس تمام تر جانبداری کے باوجود وزارتی مشن کو ۲۰ مئی ۴۶ء کو گاندھی کا جو مراسلہ وصول ہوا اور اس میں جو مطالبات کئے گئے اس کی توقع یہ دو حضرات بھی نہیں کرتے تھے۔ اس خط کے مندرجات کیا تھے' انہیں اگر صاف اور سیدھے الفاظ میں سمجھا جائے تو بات یہ تھی کہ حکومت کو کلیتاً کانگرس کے حوالہ کیا جائے اور بعد میں ہم جانیں اور ہمارا آئین جانے' یہ ہندوستان ہے اور اس میں کسی اور کو مداخلت کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ جن الفاظ میں اس نے اپنے اس مقصد کو بیان کیا' وہ یہ تھے کہ مجوزہ آئین ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخابات سے پہلے عبوری حکومت کا وجود میں آنا ضروری ہے جسے قومی حکومت کا نام دیا جائے۔ اس نے دونوں بڑی جماعتوں کی مخلوط حکومت کی مخالفت کی' پیریٹی کے اصول کو بھی رد کیا اور کہا کہ یا تو کانگرس کو حکومت بنانے کے لئے کہا جائے یا پھر مسلم لیگ کو۔ گویا گاندھی نے عبوری حکومت کے قیام یا دوسرے الفاظ میں انتقال اقتدار کو اولیت اور آئین سازی کو ثانوی حیثیت دی۔

گاندھی جانتا تھا کہ کل ہندوستان کا نہ مسلم لیگ دعویٰ کرتی ہے اور نہ کبھی انگریز اسے مکمل اقتدار منتقل کرے گا۔ کیبنٹ مشن پلان کے بارے میں راقم نے جو اتنی مفصل اور طویل بحث کی ہے تو اس کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ قارئین جان سکیں کہ کانگرس نے کیبنٹ مشن پلان کو کبھی بھی اور کسی سطح پر بھی قبول نہیں کیا۔ البتہ قائداعظم نے جو تصادم کی پالیسی سے آغاز ہی سے گریز کر رہے تھے' کیبنٹ مشن پلان کی کڑوی گولی کو بڑی آہستگی اور مصلحت کے ساتھ مسلمانان ہند کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ مشن پلان کا ابتدائیہ جس میں خود مختار پاکستان کا رد ہے اور ان کا وہ خط جس میں انہوں نے ایک مرکزی حکومت کو

استحکام پاکستان
اور مسئلہ سندھ
ہر دردمند پاکستانی کیلیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے
قیمت ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن خدام القرآن
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

قبول کر لیا تھا مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت ہے لیکن وہ بڑی دور اندیشی سے اور غیر جذباتی انداز میں ہندو اور انگریز سے جنگ بھی لڑتے رہے اور مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو کنٹرول بھی کرتے رہے۔

۳ جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل اور ۵ جون کو مجلس عاملہ کے اجلاس بڑے اہم تھے۔ لارڈ ویول نے اس سے پہلے قائداعظم اور لیاقت علی خان سے پے در پے ملاقاتیں کیں اور اولاً زبانی اور بعد ازاں قائداعظم کے مطالبے پر تحریری یقین دہانی کروائی کہ اگر مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ کو قبول کر لیا تو کانگرس چاہے اسے رد بھی کر دے' کانگرس کے رد عمل کی پرواہ کئے بغیر مسلم لیگ کو عبوری ایگزیکٹو کونسل میں اس کے کوٹہ کی نشستیں دے دی جائیں گی۔ قائداعظم نے تحریری یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد وزارتی مشن منصوبہ کو اپنے تمام تر تحفظات کے باوجود مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ سے منظور کروانے کے لئے اپنی پوری اور مخلصانہ کوششوں کا وعدہ کیا۔ مسلم لیگ کونسل کے آخری اجلاس میں ووٹنگ سے پہلے قائداعظم نے جو تقریر کی اس کے اہم نکات قارئین کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گے۔ قائداعظم نے کہا "میں نے آپ کو کرپس تجاویز (۱۹۴۲ء) مسترد کر دینے کو کہا تھا' میں نے آپ کو شملہ کانفرنس (۱۹۴۵ء) رد کرنے کو کہا تھا لیکن میں کیبنٹ مشن پلان کو رد کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے۔" انہوں نے کہا "قرار داد لاہور کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہ فوری طور پر تسلیم کی جائے' یہ ایک بڑی اور مسلسل جدوجہد ہے۔ پہلی جدوجہد یہ تھی کہ لیگ کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کروایا جائے۔ ہم نے یہ لڑائی لڑی اور جیتی۔ یہ پلان قبول کر لینے سے حصول پاکستان کی جدوجہد کا خاتمہ نہیں ہو گا"

۶ جون ۱۹۴۶ء کو رات گئے آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک قرار داد کے ذریعے کیبنٹ پلان قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس قرار داد میں مشن کی جاری کردہ دستاویز کے ابتدائیہ میں مطالبہ پاکستان کی جو مخالفت کی گئی تھی اس کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اعادہ کرتی ہے کہ پوری طرح خود مختار پاکستان کے حصول کا مقصد اب بھی مسلمانان ہند کا ناقابل ترمیم نصب العین ہے' جس کے حصول کی خاطر اگر ضروری ہوا تو وہ اپنے بس میں سارے ذرائع بروے کار لائیں گے اور کسی قربانی کو خاطر میں نہیں لائیں گے' تاہم وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے کی دو اہم وجوہ بیان کی گئیں۔ اول یہ کہ مسائل سنگین ہیں اور مسلم لیگ ان کے پر امن حل کی خواہاں ہے۔ دوئم یہ کہ منصوبہ میں پاکستان کے قیام کی بنیاد موجود ہے کیونکہ مسلم اکثریت کے چھ صوبوں کے دو گروپس "ب" اور "ج" کی صورت میں لازمی گروپنگ کی گئی ہے۔ کونسل نے امید ظاہر کی کہ بالآخر یہ منصوبہ مکمل طور پر خود مختار پاکستان کے قیام پر منتج ہو گا۔ اس طرح مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ قبول کر کے اگر مطالبہ پاکستان سے دستبرداری اختیار نہیں کی تھی تو کم از کم اس کے حصول کو دس سال کے لئے مؤخر ضرور کر دیا تھا۔

مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے کا اعلان کیا تو یہ پہلے ہی سب کو معلوم تھا کہ اب ایگزیکٹو میں مسلم لیگ کے لئے مخصوص پانچ نشستیں اس کی ہو گئیں خواہ کانگرس منصوبہ قبول کرے یا رد کرے۔ چنانچہ کانگرس کے لئے یہ بات کہ مسلم لیگ حکومت میں ہو اور کانگرس حکومت سے باہر اور اگر حکومت میں ہو بھی تو مسلم لیگ کی ہم پلہ یعنی پانچ نشستوں ہی پر قابض ہو' ایک ایسی بات تھی جسے ہندو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کانگرس نواز ہندو پریس بلبلا اٹھا اور مجوزہ ایگزیکٹو میں لیگ کانگرس پیریٹی پر طوفان کھڑا کر دیا گیا۔

کانگرس نے پیریٹی کے مسئلہ پر اس قدر شدید واویلا شروع کیا اور اس مسئلہ پر ہندوؤں کے طوفانی رد عمل اور حالات کے انتہائی سنگین ہو جانے کا اس قدر شدید پروپیگنڈا شروع کر دیا اور عبوری حکومت کے مسئلہ کو اتنی شدت سے اٹھایا کہ کوئی انہیں یہ پوچھنے والا نہ رہا کہ وہ پہلے سرکاری سطح پر یہ اعلان تو کریں کہ انہوں نے بھی مسلم لیگ کی طرح وزارتی مشن منصوبہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ کانگرس کے بعض لیڈر نجی محفلوں میں یہ کہتے رہے کہ ہمیں بھی وزارتی مشن منصوبہ قبول ہے گو اس کی بعض شقیں قابل اعتراض ہیں لیکن کانگرس کی مجلس عاملہ کی طرف سے اس کے قبول کر لینے کا کوئی باقاعدہ اعلان نہیں ہوا اور اسی منظور نامنظور کی کیفیت میں بات اگلے مسئلہ پر سرک گئی۔ ایسا دو وجوہ کی بنا پر ہوا' اولاً یہ کہ برطانوی حکومت اور ان کا نمائندہ وائسرائے ہند ہمیشہ کانگرس کو ہندو ملی اول اور بڑی قوت قرار دیتا تھا چنانچہ جب کانگرس کوئی معاملہ عوامی سطح پر اٹھاتی تو انتظامیہ الرٹ ہو جاتی اور کانگرس کو ہر طرح مطمئن کرنا چاہتی' ثانیاً جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ وزارتی مشن کے تین میں سے دو ارکان پیتھک لارنس اور کرپس کانگرس کی جائز ناجائز حمایت پر تلے ہوئے تھے' راقم کی رائے میں کانگرس نے وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری کے بارے میں کوئی حتمی اعلان کے بغیر جو عبوری حکومت اور پیریٹی کے سلسلہ پر واویلہ شروع کر دیا اس کی پشت پر یہ دونوں اصحاب تھے۔

بہرحال وائسرے ہند لارڈ ویول نے پیریٹی کے مسئلہ پر آغاز میں ثابت قدم رہنے کے عزم کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وائسرائے ہند لارڈ ویول اپنی ڈائری میں لکھتا ہے "عبوری حکومت میں پیریٹی سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ کرپس اور پیتھک لارنس اس قدر زیادہ حد تک قول و قرار کر چکے ہیں کہ اب وہ نہ تو اس قابل ہیں اور نہ ہی وہ چاہتے ہیں کہ کانگرس کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں"۔ ۷ جون ۱۹۴۶ء کو جب ویول جناح ملاقات ہوئی تو قائداعظم نے ۵:۵:۲ کے تناسب پر زور دیا یعنی ۵ ہندو' ۵ مسلم اور ۲ باقی اقلیتیں' اور ویول کو یاد دلایا کہ وہ اس بارے میں یقین دہانی کروا چکے ہیں۔ ویول لکھتا ہے کہ میں نے جواب دیا کہ " میں نے ایسا نہیں کیا حالانکہ میں خود بھی اسی فارمولہ پر کام کر رہا تھا"۔ اگلے روز جناح نے ویول کو ایک مراسلہ بھیجا کہ آپ نے مجھے ۵:۵:۲ کے تناسب کی یقین دہانی کرائی تھی' یہ بھی طے ہوا تھا کہ اہم محکمے دونوں پارٹیوں میں تقسیم ہوں گے۔ اسی یقین دہانی پر میں نے مجلس عاملہ سے وزارتی مشن منصوبہ قبول کروایا تھا۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکام پاکستان

اشاعت خاص
-/۵۰ روپے

اشاعت عام
-/۳۵ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن فون: ۸۵۶۰۰۳

ملکہ کہسار' مری میں خلافت کی اذان

وہ بابرکت نظام تو آکر رہے گا

اسے برپا کرنے کی سعادت ہمیں کیوں نہ نصیب ہو!

معاونین تحریک خلافت کی کوشش سے جمود ٹوٹ گیا ہے

شمس الحق اعوان

راقم جب بھی آزاد کشمیر کے تنظیمی دورے پر جاتا' راستے میں مری کے بلند و بالا پہاڑی سلسلے کو عبور کرنا پڑتا اور دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کوئی موقع پیدا فرما دے تو ان سربفلک چوٹیوں سے بھی خلافت کا آوازہ بلند کر دیا جائے لیکن عالم اسباب خواہشوں سے نہیں بلکہ اسباب کے دم سے چل رہا ہے چنانچہ ضروری تھا کہ اس خواہش کی تکمیل کا سامان کیا جائے۔ پروٹ کے معاونین سے بات کی گئی تو انہوں نے اشتیاق ظاہر کیا کہ امیر محترم سے یہاں جلسے میں شرکت کی درخواست کی جائے اور یوں اللہ تعالیٰ نے سبب بھی بنا دیا۔ پھر انتظامی راہداریوں سے گذرتی ہوئی یہ بات امیر محترم کے کانوں تک جا پہنچی تو انہوں نے کمال مہربانی سے حامی بھر لی اور ۲۵ مئی بروز منگل سہ پہر کا وقت مقرر کیا گیا۔

مری کی انتظامیہ سے اجازت کے مراحل بڑی آسانی سے طے پا گئے۔ البتہ ۲۶ مئی کے لئے آرٹس کونسل کے ہال کی اجازت ریزیڈنٹ ڈائریکٹر شکیل احمد کی خواہش کے باوجود نہ مل سکی۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اسلامی ریاست میں ناچ گانوں کے لئے تو اعلیٰ ترین سہولتیں آسانی سے میسر آ جاتی ہیں لیکن دینی پروگرام کے لئے معمول کی سہولتیں بھی مہیا نہیں کی جا سکتیں۔ دینی پروگرام یا تو کسی گلی کے نکڑ پر یا کسی مسجد میں ہی ممکن ہے اور مسجدوں میں مسلکوں کی اجارہ داری ہے۔ جلسہ عام کے لئے منصوبہ بندی کی گئی اور طے پایا کہ مری سے ۲۰ کلومیٹر کے دائرے میں پبلسٹی' ہینڈبل' اشتہارات' چاکنگ' کارنر میٹنگ اور اعلانات کے ذریعے کی جائے۔ چھیکا گلی میں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر سائٹ آفس بنایا گیا اور خالد محمود عباسی کو اس کا انچارج بنایا گیا جس نے مری سے کوہالہ' ایوبیہ' پیڑیانہ اور مری گھوڑا گلی تک اشتہارات اور چاکنگ کا خوب انتظام کیا۔

راولپنڈی سے غلام مرتضیٰ اعوان امیر تنظیم اسلامی کی قیادت میں ۲۴ رفقاء اور معاونین دو روزہ لگانے کے لئے مری پہنچے جنہوں نے ۲۱ اور ۲۲ مئی کے دو دنوں میں مری اور اس کے نواح میں تحریک خلافت کی دعوت کو عام کیا۔ اس مقصد کے لئے دس ہزار ہینڈبل اور ۱۳ سو پوسٹر چھپوائے گئے تھے' نیز ۱۵ بینر مختلف مقامات پر لگائے گئے۔

۲۵ مئی کو جلسہ عام بعد نماز ظہر اڑھائی بجے شروع ہو گیا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد خالد محمود عباسی صاحب نے سورۂ نور کی آیات ۵۴ اور ۵۵ کی وضاحت کی۔ مقامی لہجے میں سامعین کو خلافت کے قیام کے لئے انقلابی مراحل مفصل انداز میں بیان کئے جس کے بعد انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب ناظم تنظیم اسلامی حلقہ جنوبی پنجاب اور ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان نے نظام خلافت کے خدوخال بیان کئے۔ انہوں نے مروجہ نظام جاگیرداری اور زمینداری کے نقائص بیان کئے۔ اور مدلل انداز میں نظام خلافت کی برکات بیان کیں۔ راقم نے امیر محترم کے مشن کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ جلسہ ملک کی غیر یقینی کیفیت میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس جلسہ کی منفرد شان یہ بھی ہے کہ اس میں کسی کے لئے زندہ باد یا مردہ باد کا نعرہ نہیں لگایا جائے گا بلکہ ایک مثبت پروگرام لوگوں کے سامنے رکھا جائے گا۔ یہ وہ مشن ہے جس کے لئے امیر محترم گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھوم رہے ہیں۔ وہ خلافت کی وہی خوشخبری عام کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں جس کی طرف علامہ اقبال نے بھی اپنی ایک نظم میں یوں اشارہ کیا ہے۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہو گا نغمہ توحید سے

ساڑھے تین بجے امیر محترم نے مائیک سنبھالا اور دل نشین انداز میں خطاب شروع کیا۔ تقریباً پونے دو گھنٹے پر محیط اس خطاب نے جہاں لوگوں کو خاصا متاثر کیا وہیں ڈاکٹر صاحب کے گلے کی تکلیف کافی شدت اختیار کر گئی جس کے آثار پہلے ہی موجود تھے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے نہایت اطمینان سے خطاب جاری رکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ روس کے ختم ہو جانے کے بعد امریکہ ہی واحد سپر پاور بن گئی ہے۔ اس کی ٹیکنالوجی اور اسلحہ سازی کی صنعت بہت آگے نکل چکی ہے جبکہ ہم ابھی طفل مکتب ہیں۔ اس میدان میں ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے لہٰذا ہمیں چاہئے کہ اس کی نقالی کرنے کی بجائے حضورؐ کی دی ہوئی تعلیمات پر عمل کر کے نظام خلافت

کو قائم کریں اور اپنے وطن کو امن و سکون کا گہوارا بنائیں۔ انہوں نے عالمی پس منظر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا کہ اس وقت مسلمان دنیا کی آبادی کا ۱/۴ ہیں اور پچاس سے زائد اسلامی مملکتیں دنیا کے نقشے پر موجود ہیں۔ ہم تیل اور دیگر قدرتی وسائل کی دولت سے مالا مال ہیں لیکن پھر بھی ہر جگہ پٹ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی دولت یورپ کے بنکوں میں ہے اور وہ جب چاہیں اس کو منجمد کر سکتے ہیں۔ انہوں نے پہلے عراق کو ایران کے خلاف بھڑکایا اور ایک بے مقصد جنگ شروع کرا دی' پھر عراق کو اکسا کر کویت پر حملہ کراویا اور پھر دیگر عرب ملکوں کی مدد سے عراق کا بھرکس نکال دیا۔ اس ساری سازش میں مسلمان امریکہ کے آلۂ کار بنے رہے لیکن کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ سازش کی تہہ میں کیا ہے۔

اب وہ پاکستان کے گرد جال پھیلا رہے ہیں اور بھارت کی حکومت اور انتہا پسند ہندو تنظیم آر ایس ایس اس بات پر تلی ہوئی کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال دیا جائے۔ ان کا کھلے عام نعرہ ہے کہ مسلمان کے دو استھان' پاکستان یا قبرستان۔ دوسری طرف پاکستان کو دہشت گرد قرار دینے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں تاکہ اس کا معاشی مقاطع کر کے بھوک اور افلاس کے تاریک گڑھے میں پھینک دیا جائے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بھی ہوش کے ناخن لیں اور اجتماعی توبہ کریں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ وہ افراد کا معاملہ تو آخرت میں چکائے گا لیکن قوموں کا فیصلہ اسی دنیا میں کر دیا جاتا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

امیر محترم نے یہ بھی فرمایا کہ ان تاریک آندھیوں میں تحریک خلافت امید کے چراغ جلائے ہوئے ہے اور قرآن حکیم اور آنحضورؐ کی احادیث کی روشنی میں ہمارا یقین ہے کہ وہ دور ایک بار پھر ضرور آئے گا جس میں نظام خلافت قائم ہو گا' امن و سکون کی بارش ہو گی' اخوت اور محبت کی خوشبو سے ساری دنیا معطر ہو جائے گی' لاچار اور بے کس طبقات کے سربلند ہوں گے اور بے خدا تہذیب کی جگہ دنیا نغمہ توحید سے گونج اٹھے گی لیکن اس نظام کو لانے کے لئے سرفروشوں کی ضرورت ہے جن کا نعرہ مستانہ یہ ہو کہ۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں' میں اسی لئے نمازی

اور یہ منزل انتخابات کی گہما گہمی کی بجائے انقلاب کی پر خار وادی سے گزر کر نصیب ہو گی جس میں ہم دشت و دریا کے علاوہ کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جانے کے لئے تیار ہیں۔

بعد نماز عشا علامہ مظفر عباسی صاحب سابق وائس پرنسپل پی ایف کالج لوئر ٹوپہ نے سوال و جواب کی نشت کا اہتمام کیا جس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اور مختلف دینی شخصیات نے شرکت کی۔ اگلے دن ۲۶ مئی کو مختلف وفود نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی۔ دوپہر کے کھانے کا انتظام اہالیان پروٹ نے کیا تھا' وہاں بھی کھانے سے قبل تقریباً ۱۳۰ افراد جمع ہو گئے' سوال و جواب کا دور یہاں بھی چلا اور بند ذہنوں کے دریچے کھلتے گئے۔ نماز ظہر کے بعد اسلام آباد واپسی ہوئی۔ نماز مغرب کے بعد امیر محترم نے جناب ظفرالامین اور محمد صدیق صاحب سے گفتگو کی اور یہ طے پایا کہ انجمن خدام القرآن کے کام کو ٹھوس بنیادوں پر اٹھانے کے لئے منصوبہ بندی کی جائے گی۔

اس جلسہ کے راقم نے جو اہداف مقرر کئے تھے' وہ بڑی حد تک پورے ہوئے اور مری اور پروٹ کے معاونین کو متحرک ہونے کا موقع ملا۔ بالخصوص محمد حسین صاحب اور ان کے صاحبزادگان کی ذاتی اور مالی کوششوں نے اس پروگرام کی کامیابی میں بڑا کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں مری کے علاقہ میں تحریک خلافت اور تنظیم اسلامی کی خوب پبلسٹی ہوئی اور دس نئے معاونین کا اضافہ بھی ہوا۔

اعتذار

پچھلے شمارے میں تحریک خلافت پاکستان کے ملتان کنونشن کی روداد کے ساتھ مقررین کی اکٹھی جو تصاویر دی گئی تھیں ان کے اسمائے گرامی کے اندراج میں ایک مقرر کا نام شامل ہونے سے رہ گیا اور ہمیں ایک کرم فرما قاری نے توجہ دلائی ہے کہ اس سہو کے باعث زیادہ دشواری جناب مختار حسین فاروقی کو پہچاننے میں ہوئی جن کی حیثیت مرکزی خلافت کمیٹی کے ناظم ہونے کے ناطے اہم بھی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ نوجوان مقرر مرزا ندیم بیگ کا نام وہاں درج نہ ہوا جو تحریک کے آتش بیان مقررین میں منفرد مقام رکھتے ہیں اور یہ ساری الجھن انہی کا نام نہ آسکنے کے باعث پیدا ہوئی۔ اس کی تلافی میں ہم ان دونوں حضرات کی تصویریں دوبارہ شائع کر رہے ہیں ____ (ادارہ)

انجینئر مختار حسین فاروقی۔ جو مرکزی مجلس عاملہ ے تازہ فیصلے کے مطابق مرکزی خلافت کمیٹی کے اظم ہونے کی وجہ سے اب ناظم اعلیٰ تحریک خلافت کستان کہلائیں گے۔

ڈسکہ کے مرزا ندیم بیگ جو تحریک خلافت پاکستان کی علاقائی کمیٹی گوجرانوالہ کے ناظم ہیں۔

فرار کی یہ زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی

یہ دیکھو! مسجد کے بلند مینار

تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا آزادی کے فوراً بعد جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے ایک تاریخی خطاب

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا' جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا' اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔

آج تمہارے چہروں کو اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے' میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے' میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی' حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے' اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا۔ لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا' بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے' جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا' جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا' وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی' بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے' سوچو تو سہی' تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمہارے حواس میں اختلاف نہیں آ گیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے' اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے' نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی' اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتاری تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمتی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا' وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمہاری دماغی لغت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی' اور رہنمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے' وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے' اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے' میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا' اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا' میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا' تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا' ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا' جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے"۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی' بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے' جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس

کی جگہ بری شے آگئی ہے۔ ہاں، تمہاری بے قراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لئے خود کو تیار نہیں کیا تھا، اور بری شے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے، جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آگیا۔

میرے بھائی، میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوتی ہیں لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔

متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو [illegible] اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے [illegible] مقامات پر آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے، لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لئے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے علاوہ کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو، اور پھر دیکھو کہ یہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟۔

یہ دیکھو! مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا، اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو، جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا، آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی اسی طرح بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انہوں نے تمہیں جانے کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انہوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو، تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہوگئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں، تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا تھا:

"جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"۔

ہوائیں آتی ہیں گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلاء کا موسم گزرنے والا ہے، یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں، اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہوگئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو، اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو، اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا، انہیں بھلاؤ نہیں--- انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ! عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں، وہ تمہارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی، تو اس کا رخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے، اور خدا سے اس درجہ غافل ہوگئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

ہمیں آزاد معاشرہ تو درکار ہے "مادر پدر آزاد" معاشرہ ہرگز نہیں

ایک سابق وفاقی وزیر کی گل فشانی گفتار

عورت کے حق میں غیرت مولوی کی ہی جاگتی ہے

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

> گیلانی صاحب کی اس عبرتناک لیکن دلچسپ تحریر کا پہلا حصہ "ندائے خلافت" میں کچھ دنوں پہلے شائع ہوا تھا۔ پھر متعلقہ وفاقی وزیر صاحب کی چھٹی ہو گئی تو ہم نے باقی حصے کی اشاعت کو التواء میں ڈال دیا کہ مرے کو سو درے مارتے ہم کیا اچھے لگیں گے۔ وہ تو خود ہی اپنے انجام کو پہنچ گئے ہیں۔ پھر "نگران" حکومت آئی اور وہ صاحب دوبارہ کابینہ میں لے لئے گئے تو ہم نے بھی گویا بانگ لگائی کہ لاتا غنچہ میرا قلم دان! اور اس کے آنے تک حکومت کی بساط ایک بار پھر الٹ گئی۔ سردار آصف احمد علی صاحب اب پھر سابق وزیر ہو گئے ہیں لیکن ان کے ارشادات کے جواب میں گیلانی صاحب کی خوبصورت باتوں سے ہم اپنے قارئین کو مزید محروم نہیں رکھیں گے ______ ادارہ

وفاقی وزیر کی گل فشانی گفتار کا دوسرا نکتہ یہ ہے "مولوی' عورت کو چہار دیواری کے اندر قید کرنا چاہتے ہیں حالانکہ عورتوں نے مختلف غزوات میں بغیر پردے کے' شرکت کی تھی۔ رضیہ سلطانہ کیا مردوں کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لیتی تھی۔؟"

اس نکتے کے چار اجزاء ہیں۔ مولوی' عورت کی چار دیواری میں قید' غزوات میں بے پردہ عورت کی شرکت' اور رضیہ سلطانہ کی مردوں کے ساتھ مل کر جنگ'

ایک تو نہ جانے درمیان میں "مولوی" بار بار کہاں سے ٹپک پڑتا ہے؟ کون کمبخت کہتا ہے کہ آپ مولوی کی بات مانیں... دوسرے یہ کہ "مولوی" غریب کی اور کتنی باتیں مانی گئی ہیں جو یہ مان لینا اب ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ اصل گلے کی پھانس یہ ہے کہ سردار صاحب کی قبیل کے لوگ غصہ تو قرآن و سنت پر نکالنا چاہتے ہیں' درمیان میں مولوی ان کی پکڑ میں آجاتا ہے' اس لئے کہ تمام تر تنگی ترشی' غربت' فقر' اور بدحالی کے باوجود مولوی نے خدا اور رسول سے اپنا رشتہ وفا قائم کر رکھا ہے' اگر مولوی بھی جناب سردار آصف احمد علی' سردار بلخ شیر مزاری' سردار اکبر بگٹی' سردار فاروق لغاری' سردار غلام مصطفیٰ جتوئی اور سردار شوکت حیات کے بزرگوں کی طرح اپنا رشتہ "انگریز بہادر" سے جوڑ لیتا تو اسے آج تنگ نظری' رجعت پسندی اور بدحالی کے طعنے نہ سننے پڑتے۔ ان حضرات کے بزرگان گرامی نے کبھی وائسرائے ہند' کبھی شاہ برطانیہ' کبھی گورنر اور کبھی انگریز ڈی سی اور ایس پی کے درباروں کو رونق بخشی اور اپنا مول پایا۔ مولوی بیچارا اس ضمیر فروشی کے نیلام گھر اور لوٹ سیل کے دور میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن' مولانا عبید اللہ سندھی' مولانا فضل حق خیر آبادی' مولانا کفائت اللہ کافی' مولانا احمد اللہ شاہ مدارسی' مولانا تاج محمود امروٹی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا حسرت موہانی اور خلیفہ غلام محمد دین پوری کے ساتھ چمٹا رہا تو وہ اپنی بدحالی کو خوشحالی میں کیسے بدلتا؟ وہ بدحالی کا چولا بدل سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ اسے اپنا عقیدہ بدلنا پڑتا۔ سردار صاحبان نے سوچا' اپنا نقطہ نظر بدل لو' مسئلہ "خیر و شر" بعد میں دیکھ لیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "خان صاحبان" کے مرجے اصطبل اور بنگلے بنتے گئے اور بیچارے مولوی کے لباس میں پیوند بڑھتے چلے گئے۔ مولوی پر اللہ کا یہ کرم ہے کہ اس کے دامن میں پیوند تو دور سے دکھائی دیتے ہیں' البتہ دھبے خورد بین سے بھی نظر نہیں آتے۔

اس فقرے کا دوسرا جزء عورت کو چار دیواری میں قید کرنا ہے۔ چار دیواری اور اس کے اندر رہنے کا تصور مولوی کا نہیں' قرآن اور حدیث کا ہے۔ قرآن نے بغیر ضرورت کے گھر سے باہر نکلنے کو معیوب قرار دیا ہے۔ یہ نص قطعی ہے۔ اسے امام غزالیؒ بھی چاہیں تو رد نہیں کر سکتے۔ سردار صاحب تو کسی گنتی میں ہی نہیں آتے۔

ضرورت کسے کہتے ہیں۔؟ ہر معقول آدمی کو معلوم ہے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں اور خدانخواستہ آگ لگ جاتی ہے' اب عورت پر لازم ہے کہ وہ مدد کے لئے کسی کو بلانے باہر جائے۔ بچہ بیمار ہے' ڈاکٹر کے پاس جا سکتی ہے۔ لازمی اور فوری ضروریات زندگی سے متعلقہ سودا سلف خریدنے باہر نکل سکتی ہے۔ کسی کی شادی غمی میں جا سکتی ہے۔۔ غرض ضرورتوں کا شمار نہیں اور قرآن و حدیث نے ہر ضرورت کو پورا پورا وزن دیا ہے۔ لڑکیاں حصول تعلیم کے لئے باہر جا سکتی ہیں' کون روکتا ہے۔؟ لیکن اس کے ساتھ باہر نکلنے کے آداب بھی قرآن اور حدیث نے سکھا دیئے ہیں۔ ہر اہل علم قرآن حکیم میں سے وہ آیات دیکھ سکتا ہے جو اس ضمن میں نازل ہوئیں۔ اس میں جھگڑنے والی کون سی بات ہے؟ اگر ہم مسلمان ہیں تو قرآن کے ان احکام و آداب کی رعائت ہم پر لازم ہے۔ یہ کسی صوفی کے ملفوظ اور کسی ادیب کی عبارت آرائی کا نہیں بلکہ قرآن و سنت کے واضح نصوص کا مسئلہ ہے' اسے بچگانہ انداز میں نہیں لینا چاہئے۔

جو ضرورتیں ہم نے اوپر گنوائی ہیں' ان کے علاوہ بھی بے شمار ضروریات ہیں جنہیں پورا کرنے کو ہر شریف زادی ستر و حجاب کے تقاضے ملحوظ رکھ کر ہسپتال' سکول' کالج' مارکیٹ اور عزیزوں کے گھر جا سکتی ہے۔ لیکن ان چیزوں کو ضروریات کا درجہ کب حاصل ہوا ہے کہ ہماری بہن بیٹیاں بن سنور کر کرکٹ میچ دیکھنے تشریف لے جائیں اور وہاں نعرہ ہائے تحسین سے کھلاڑیوں کے حوصلے بلند کریں یا کیلے اور سنگترے کے چھلکے مار کر کھلاڑیوں کا حلیہ

بگاڑیں۔؟... الحمرا میں ڈرامہ سٹیج کرنے کیلئے آراستہ ہو کر جائیں۔؟.. رات کو جب شاپنگ سنٹروں میں چکا چوند بڑھے تو ہماری صاحبزادیاں پورے عشوہ و غمزہ کے ساتھ ہوا خوری کو وہاں قدم رنجہ فرمائیں اور رات کا نصف حصہ مٹرگشت میں صرف کریں۔؟.. فن موسیقی سیکھنے کیلئے کسی "استاد بڑے خان صاحب" اور کسی "استاد چھوٹے خان صاحب" کے پاس رات دن ایک کردیں۔؟ اس سے کون سی قومی ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے۔؟؟

گھر کی چار دیواری کو قید سے تعبیر کرنا وزیر موصوف کی اپج ہو سکتی ہے یا ماڈرن خواتین کی جھنجلاہٹ۔ ورنہ گھر کی چاردیواری عورت تو کیا' مرد کیلئے بھی گہوارہ امن ہے۔ پناہ گاہ ہے۔ خوشیوں کا گلشن ہے۔ گھر اگر قید خانہ ہے تو سکھ چین کیلئے کون سی جگہ تلاش کی جائے۔؟ نائٹ کلب۔؟ سٹیڈیم۔؟ فٹ پاتھ۔؟ شاپنگ سنٹر۔؟ ہوٹل۔؟ سیرگاہیں۔؟؟... پرلے درجے کا احمق ہے وہ شخص جو گھر سے باہر سکون کی تلاش میں ہے اور بڑا بدبخت ہے وہ آدمی جسے خدا نے اپنا گھر اور چار دیواری عطا کر رکھی ہو وہ پھر بھی اسے قیدخانہ سمجھے۔ اس عورت سے بڑھ کر عاقبت نااندیش اور نادان عورت اور کون ہوگی جو اپنے بہن بھائیوں' ماں باپ اور بچوں کے ساتھ گھر میں رہ کر ناآسودگی محسوس کرتی ہے اور خود کو قیدی سمجھتی ہے اور بازار اور فٹ پاتھ پر ایرے غیرے کے ساتھ چلنے کو آزادی اور خوشی کا موجب قرار دیتی ہے۔؟.. "چار دیواری کی قید".. ایسا مبتذل اور لغو فقرہ آج کی ماڈرن سوسائٹی کی روزمرہ بول چال کا حصہ بن گیا ہے۔! نہ جانے اس سے کیا مراد لی جاتی ہے؟

اس نکتے کا تیسرا جزو مختلف غزوات میں عورتوں کی' بغیر پردے کے' شرکت ہے۔ اس سلسلے میں بھی سردار آصف کی فکر نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ کس غزوے میں عورتوں نے پردے کے بغیر شرکت کی ہے۔؟.. اگر یہ ثابت ہو جائے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ شرعی حجاب کے بغیر یا ماڈرن لوگوں کے مزعومہ پردے کے بغیر؟ اور اس بات کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ غزوہ (جنگ) ہمیشہ سے ایمرجنسی کی کیفیت کا نام ہے اور ایمرجنسی کی حالت میں احکام و قوانین کے اندر معمولی تغیر و تبدل' حکمت کا عین تقاضا ہے لیکن آج کی بے پردگی اور غزوات میں خواتین کی شرکت کا آپس میں کیا تعلق ظاہر ہو رہا ہے۔؟.... یہ تو انتہائی لغو استدلال ہے۔۔ کہاں غزوات میں عورتوں کی شرکت اور کہاں فیشن ڈریس شو میں بیگمات کا مقابلہ آرائش۔؟.. کہاں عورت کا جنگ میں تیغ بدست ہونا اور کہاں فلمی ہیروئین کا ہیرو کے گلے میں بانہیں ڈالنا۔؟.. کہاں معرکوں میں عورتوں کا مشکیزے بھر بھر کر زخمیوں کو پانی پلانا اور زخمیوں کا پہرہ دینا اور کہاں آج کی خواتین کا سال نو وغیرہ کے جشن میں ہنگامہ حسن برپا کرنا۔؟.. کہاں عورتوں کا جنگی مجاہدین کی مرہم پٹی اور تلواریں اور نیزے تیز کرنا اور کہاں دلدادگان فیشن کا بسنت میں میں چھتوں پر چڑھ کر پتنگ اڑانا اور "بوکاٹا" کی سریلی چیخیں بلند کرنا۔؟؟.. یہ تو کوے کی دم میں سرخاب کا پر ٹانکنے والی بات ہوئی۔

ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ خواتین زندگی اور دنیا کے تمام کاموں میں مثبت طریقے سے بھرپور خدمات سرانجام دیں۔ جس طرح مردوں کا قبیلہ بہت وسیع ہے' خواتین کا میدان ان سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ وہ کام کرنا چاہیں تو عمر کم پڑ سکتی ہے' ذمہ داریاں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر تو ان کی شرط یہ ہے کہ مردوں والے کام وہ سنبھالیں گی اور ان کے ہر کام میں حصہ دار بنیں گی تو یہ کام کرنے کی نیت نہیں' بحث کا دروازہ کھولنے والی بات ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیہات میں عورتیں مردوں کے برابر بلکہ بڑھ کر کام کرتی ہیں اور اس پر کسی "مولوی" کو اعتراض نہیں اور سردار صاحب ایسے لوگ ان کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ اصل بحران تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہمارے "منسٹر" گھیر گھار کر اپنی بیگمات اور صاحبزادیوں کیلئے رقص' موسیقی' ڈرامہ' جشن' میلہ' فلم' سٹیج' نیم نیوایئر میں بھرپور شرکت کے حقوق مانگتے ہیں۔ رجال دین' بلکہ ہر باشعور اور ذمہ دار شہری کے نزدیک یہ کام ایسے نہیں جن کیلئے "ایکشن فورم" بنا کر حقوق سلبی کی دہائی دی جائے اور یہ خبط ذہنوں میں اس قدر سما جائے کہ اسلام کو اللہ اور رسول کا دین سمجھنے کے بجائے علی الاعلان کہہ دیا جائے "ہم مولوی کے دین کو نہیں مانتے۔! مولوی ہمیں چار دیواری میں قید رکھنا چاہتے ہیں۔! مولوی کا قانون نہیں چلے گا۔!!".. وغیرہ

اس نکتے کا چوتھا جزو ہے رضیہ سلطانہ کا مردوں کے ساتھ مل کر جنگ کرنا۔!

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس حوالے سے کیا ثابت کرنا مقصود ہے۔؟.. کیا رضیہ سلطانہ کا مردوں کے ساتھ یا مردوں کے مقابلے میں جنگ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام میں عورت سٹیج شو کر سکتی ہے یا ایئرہوسٹس بن سکتی ہے۔؟.. پردہ ایک طرف پھینک سکتی ہے یا ہر معاملے میں مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔؟

رضیہ سلطانہ مسلمانوں کی تاریخ کی ایک حکمران گزری ہے اور بس۔!.. اس سے زیادہ اس بات کو استدلال اور دین کی بارگاہ میں کوئی وزن نہیں دیا جا سکتا۔ دلیل کیلئے قرآن' سنت' حدیث' رسول کا عمل' صحابہ کا تعامل اور ائمہ فقہا کا اجماع درکار ہے نہ کہ رضیہ سلطانہ کا کوئی فعل۔ ایک لمحے کیلئے رضیہ سلطانہ کے اس عمل کو دلیل بنا بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ وہ اچھی حکمران تھی' زبردست منتظم تھی' باصلاحیت سپہ سالار تھی اور انتہائی نڈر اور جرات مند تھی۔ وغیرہ۔ ان اوصاف کی ہر آدمی قدر کرتا ہے لیکن اس سے یہ کہاں برآمد ہو گیا کہ عورت مجرا کر سکتی ہے' مقابلہ حسن میں شریک ہو سکتی ہے یا باکی اور قبائل کھیل سکتی ہے۔؟

ہم یقیناً چاہیں گے کہ ہماری خواتین بھی اچھی منتظم ہوں' ضروری نہیں کہ حکومت کا ہی انتظام سنبھالیں۔ اور بھی تو کئی شعبے ہیں۔۔ خواتین نڈر اور جرات مند ہوں' ضروری نہیں کہ وہ اسلامی اقدار کے مقابلے میں جری ہو جائیں۔

اگر آج رضیہ سلطانہ ہمارے لئے دلیل ہیں تو کل کو یہ "روشن خیال" لوگ "ملکہ ترنم" اور "ملکہ موسیقی" کو بھی آئمہ فقہا کے مقابلے میں لے آئیں گے اور ان کی بات کو دینی حوالے کا درجہ دے دیں گے۔۔ کج فکری کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔

سردار صاحب کی تقریر میں ایک نکتہ یہ اٹھایا گیا ہے کہ "اگر کوئی عورت کار چلا رہی ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔؟ قصور تو اس مولوی کا ہے جو بری نگاہ سے عورت کو دیکھتا ہے"

یہ طنز دراصل وفاقی وزارت مذہبی امور کی شریعت کمیٹی کی اس تجویز پر ہے جو بورڈ نے دی ہے کہ عورتوں کو گاڑی چلانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ ہمیں اس تجویز سے ذرہ برابر سروکار نہیں۔ حکومت اسے مانتی ہے یا نہیں۔؟ یہ اس کا مسئلہ ہے۔ اس تجویز کا حسن و قبح واضح کرنا ہمارا کام نہیں۔ اگر بورڈ نے تجویز دی ہے تو یقیناً انہوں نے متعدد پہلو زیر غور رکھے ہوں گے۔ اصولاً ہمیں اس میں حرج نظر نہیں آتا کہ عورت کار چلائے' لیکن اس کے ساتھ اس فقرے کی "ویلڈنگ" بڑی نامعقول ہے کہ قصور اس مولوی کا ہے جو بری نگاہ سے عورت کو دیکھتا ہے۔ یہاں خاص طور پر مولوی

کیسے مذکور ہوگیا۔؟ اس کی سمجھ نہیں آتی۔ اگر کوئی پری پیکر شانوں پر زلف لہرائے' ڈرائیونگ سیٹ پر ہوگی تو لازماً نگاہیں اٹھیں گی' مولوی کی بھی اور غیر مولوی کی بھی۔ یہ فطری سی بات ہے۔ البتہ پیدل یا سائیکل سوار مولوی کی نگاہیں کتنی دور تک اس کا تعاقب کریں گی۔؟.. اصل میں نگاہوں سمیت گاڑی تو سردار صاحب جیسے لوگوں کے صاحبزادگان کی' اس خاتون کا تعاقب کرے گی جس کا مظاہرہ مال روڈ' فورٹریس سٹیڈیم' لبرٹی مارکیٹ اور دوسری جگہوں پر آئے روز دیکھنے میں آتا ہے۔ یقین نہ آئے تو ٹریفک یا موبائل پولیس سے تصدیق کرلیجئے کہ ایسی گاڑیوں کے پیچھے مولوی کتنے سرپٹ دوڑ رہے ہوتے ہیں اور کتنے بگڑے ہوئے امیر زادے اپنی پجارو کا ڈیزل پھونک رہے ہوتے ہیں۔؟

عورت ضرورت کے تحت مہذب انداز میں اپنی گاڑی چلا سکتی ہے۔ اسلام اس معاملہ میں کوئی روک ٹوک نہیں کرتا۔ لیکن یہاں اور ہر جگہ لفظ "ضرورت" کو "انتہائی ضروری" خیال کیا جائے۔ سارا فتنہ خواہ وہ فکری ہو یا عملی' جائز حدوں کو پامال یا نظرانداز کرنے سے پیدا ہورہا ہے۔ ٹیپ کا ایک بند یہ بھی ہے کہ "پردہ کیا ہے۔؟ شرم تو آنکھوں میں ہونی چاہئے"۔ ہم بھی ہم آواز ہوکر کہتے ہیں کہ اسی شرم کے خاتمے نے سارا شر پیدا کیا ہے۔ آنکھ میں شرم ہوتی تو اخلاقی حدود سے کون تجاوز کرتا۔؟ بہن بیٹی کے رقص سے کون محظوظ ہوتا۔؟ خدا اور رسولؐ سے بغاوت کون اختیار کرتا۔؟ احکام شرعی کا مذاق کیسے اڑایا جاتا۔؟ رشتوں کا تقدس کس طرح پامال ہوتا۔؟ "گینگ ریپ" کے واقعات کس طرح رونما ہوتے۔؟ اور عورت جیسی ہستی "سیلز گرل' ماڈل گرل" اور "ہیروئین" بن کر اس قدر پستی تک کیوں پہنچتی۔؟... آنکھ میں شرم نہ ہونے کا ہی تو یہ نتیجہ ہے۔ ہم کہتے ہیں عورت باپردہ ہو' اس کے چہرے پر پردہ ہو۔ ان حضرات کا فرمانا ہے ہم سب اپنی عقل پر پردہ ڈال لیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔؟ ..ویسے اس فقرے کی منطق بھی خوب ہے کہ پردہ کیا ہے۔! شرم تو آنکھوں میں ہونی چاہئے۔ اگر ہم اسی وزن پر سوال کریں تو نجانے آگے سے کیا جواب ملے کہ یہ روٹی کیا ہے۔ اصل میں تو دل بھوکا نہیں ہونا چاہئے۔!.. یہ وزارت کیا ہے۔ اصل میں دل بادشاہ ہونا چاہئے۔!.. یہ سردی' گرمی کیا ہے۔ اصل میں تو دماغ ٹھنڈا اور دل گرم ہونا چاہئے۔!.. یہ زندگی کیا ہے۔ اصل میں دل زندہ ہونا چاہئے۔!! وغیرہ۔۔ یہ بجا ہے کہ دل بھوکا نہ ہو۔ دل کو بادشاہ ہونا چاہئے۔ دماغ ٹھنڈا اور دل گرم ہونا چاہئے اور دل زندہ ہونا چاہئے.... فقرے کا دوسرا حصہ بالکل درست ہے کہ شرم تو آنکھوں میں ہونی چاہئے لیکن جس طرح کھانے پینے' وزارت سفارت' سردی' گرمی اور زندگی سے مفر نہیں اسی طرح پردے سے بھی فرار ممکن نہیں۔

آپ کہہ رہے ہیں پردہ کیا ہے۔؟ خدا کا قرآن اور رسولؐ کی حدیث کہہ رہی ہے پردہ بہت اہم ہے۔ اب ایک مسلمان' خواہ نام کا سہی' کس کی بات مانے گا۔؟ کسی نام نہاد مسلمان کی یا حدیث اور قرآن کی۔؟ یوں لگتا ہے کہ پردے کا یہ فلسفہ خدا اور رسول کو معلوم نہ تھا' پہلی بار پاکستان کے دانشوروں کو معلوم ہوا ہے کہ پردہ تو آنکھ کا ہونا چاہئے۔ مفت میں رسولؐ خدا نے اپنی ازواج مطہراتؓ کے پردے کا اہتمام کیا' حالانکہ وہ امت کی مائیںؓ تھیں اور ماں کا کیا پردہ یا ماں سے کیا پردہ۔!.. لیکن خدا کے پیغمبرؐ نے زندگی گزارنے کے گر بتانے تھے اسی لئے حجاب کے احکام واضح کئے۔ فقط عورتوں سے داد سمیٹنا مطلوب نہیں تھا کہ ہربات کو "پیازی پیرہن" پہنا کر دنیا سے تشریف لے جاتے۔.. ایک اور جملہ بھی فرمایا گیا کہ "رضیہ سلطانہ بھی حکمران رہی ہیں اور اندرا گاندھی بھی ایک بہادر حکمران تھیں۔" ...رضیہ سلطانہ حکمران رہی ہیں' ہوا کریں۔ یہ ہمارا درد سر نہیں۔ ہم اسے مدار استدلال یا معیار حق نہیں سمجھتے۔ اس پر گزشتہ اقساط میں بات ہوچکی ہے۔ فقرے کا دوسرا حصہ خاصا مضحکہ خیز ہے اور آصف احمد علی کے واقعی "سردار" ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ اندرا گاندھی حکمران تھیں' سبھی کو معلوم ہے اور وہ بہادر بھی تھیں..؟؟ یہ کیسے پتہ چلا۔؟.. اندرا کے دور اقتدار میں دو اہم ترین واقعات رونما ہوئے جنہوں نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی۔ ایک سقوط ڈھاکہ اور دوسرے گولڈن ٹیمپل پر چڑھائی۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا واقعہ قابل ذکر نہیں بجز اس کے کہ خود شریمتی اندرا کا قتل تیسرا بڑا واقعہ ہے۔ اسلامی مملکت پاکستان کا ایک حصہ خفیہ سازش اور اعلانیہ جارحیت کے بعد کاٹ دیا گیا۔ کیا وزیر موصوف جو اہل وطن کی بدقسمتی سے پاکستان کے ارباب حکومت میں شامل رہے ہیں' اس جارحیت کو بہادری قرار دے رہے ہیں یا پھر سکھوں کے مقدس عبادت خانے پر مسلح دھاوے کو اندرا کے بہادرانہ کارناموں میں شامل کررہے ہیں۔؟.. سادہ سی بات ہے اگر وزیر موصوف کا اسم گرامی آصف احمد علی ہے تو یہ نام یقیناً مسلمانوں کا سا ہے۔ ایک مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اسلامی مملکت کے حصے بخرے کرنے والی کو بہادر قرار دے اور اگر "سردار" کا لفظ ان کے نام کا جزو لاینفک ہے تو بھی اپنے اس لاحقے کی لاج رکھتے ہوئے "سرداروں" کے گوردوارے پر اندرا کی مسلح یلغار کو بہادری سے تعبیر نہ کریں۔ موصوف دونوں یا کسی ایک نسبت کا تو بھرم رکھیں' مسلمانی کا یا "سرداری" کا۔ مانا کہ ان کے نام کے ساتھ "سردار" کا لفظ موجود ہے مگر اتنی وافر مقدار میں "سرداری" اچھی نہیں لگتی' کچھ فیصد مسلمانی کا بھی اظہار ہونا چاہئے۔ "سردار جی۔!" ہماری یہ گزارش مان لیجئے۔

وزیر اقتصادی امور سردار آصف احمد علی نے اپنی تقریر کے دوران یہ بھی شکوہ آمیز جملہ ارشاد فرمایا کہ "مولوی حضرات کی عورت کی حکمرانی کے مسئلے پر تو غیرت جاگ جاتی ہے لیکن عورتوں کے حقوق کی بات ہو تو خاموش ہوجاتے ہیں۔"

ہم شروع میں کہہ چکے ہیں کہ عورت کی حکمرانی کا مسئلہ کسی کی غیرت یا محرومیت کا نہیں' قرآن و سنت کا ہے۔ عورت کی حکمرانی ثابت ہوجائے' کون مائی کا لال ہے جو پھر بھی حجت بازی کرے۔؟ اور اگر ثابت نہ ہو تو کسی کی مجال نہیں ہونی چاہئے کہ وہ سرتابی کرے۔ یہ ہمارا موقف ہے۔ اثبات اور نفی کے حامی کسی مہذب اور مناسب فورم پر بیٹھ کر بالمشافہ بات کریں اور کٹ حجتی سے نہیں' سنجیدگی سے علم و استدلال اور تقویٰ و احتیاط کے ساتھ کھل کر بحث کریں اور کسی نتیجے پر پہنچ کر متفقہ فیصلہ صادر کریں تاکہ امت' بالخصوص اہل وطن اس الجھن سے نجات پاسکیں۔ رہی یہ بات کہ عورتوں کے حقوق کے مسئلے پر مولوی حضرات کی غیرت نہیں جاگتی۔!.. تو یہ سب کچھ "بحث برائے بحث" ہے۔ لڑاکا عورتوں کی طرح کوٹھے پر چڑھ کر کوسنے دینا' سردار صاحب کے منصب کے منافی ہے۔ اسے بھی بے رحم زمانے کی ستم ظریفی کہا جاسکتا ہے کہ کسی دور میں "وزیر" کے منصب کیلئے نظام الملک طوسی' یحییٰ برمکی اور آصف جاہ جیسے لوگ منتخب کئے جاتے تھے اور اب قوموں کو سردار آصف جیسے لوگوں سے پالا پڑ گیا ہے۔ ظاہر ہے ہر شعبے میں زوال بڑھے گا تو آثار قیامت نمودار ہوں گے۔ ہم تو ایسے لوگوں کو "آثار قیامت" کے طور پر چار و ناچار قبول کئے بیٹھے ہیں۔

تاہم عورتوں کے حقوق کے مسئلے پر سب سے زیادہ غیرت بحمداللہ "مولوی حضرات" کی جاگتی ہے جب وہ چادر اور چار دیواری کی بات کرتے ہیں' "الگ یونیورسٹی کا مطالبہ کرتے ہیں' مردوں کے ساتھ عورتوں کے کھیل کو ممنوع قرار دیتے ہیں' ریڈیو اور ٹی وی پر غیر محرم کی آواز اور صورت کی نمائش پر بندش کی قرارداد منظور کرتے ہیں' "نیو ایئر" کی ڈانس پارٹیوں پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہیں ... عورتوں کیلئے الگ سٹیڈیم' الگ کالج' الگ شاپنگ سنٹر اور الگ سیٹس کی تجویز پیش کرتے ہیں تو یہ ان کی غیرت کا اظہار ہوتا ہے کہ بنت حوا کو اپنی پست خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہ بنایا جائے' اس کے حسن کو نیلام گھر کا سودا نہ بنایا جائے' اس کی نسوانیت کو منڈی کا مال نہ بنایا جائے' اس کی ذات کو زینت محفل نہ بنایا جائے اور اس کے تقدس کو تجارتی اشتہار نہ بنایا جائے۔ یہ غیرت نہیں تو اور کیا ہے۔؟ غیرت تو "ان" کی لمبی تان کر سوگئی ہے جو اپنی بہن بیٹیوں کو اپنا خاوند تلاش کرنے کے کام پر لگادیتے ہیں کہ جاؤ اور اپنے مطلب کا آدمی ڈھونڈو۔ غیرت تو اس باپ کی مرگئی ہے جس کا لاڈلا اپنے مزارع کی بیٹی' بہن اور بیوی کو اپنی جاگیر کا ایک حصہ سمجھ کر قابل خرید و فروخت سمجھتا ہے اور باپ اس کا پورا تحفظ کرتا بلکہ اس کیلئے ووٹ مانگتا اور حق نمائندگی دلانے کی تگ و دو کرتا ہے۔ غیرت تو اس شخص کی بن باس لے گئی ہے جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی صاحبزادی کو کسی نوجوان کے ساتھ محو رقص دیکھ کر فخریہ نگاہوں سے داد وصولتا ہے۔ غیرت تو اس طبقے کی مرگئی ہے جس میں خاوند اور بیوی کو اپنے الگ الگ "فرینڈز" بنانے کی آزادی حاصل ہے۔ غیرت تو ان لوگوں کی جلاوطن ہوگئی ہے جن کی لاڈلیاں عالمی مقابلہ حسن میں شریک ہونے جاتی ہیں اور مقابلے جیت کر یا اپنی آبرو ہار کر واپس لوٹتی ہیں۔ غیرت تو ان حضرات کی طویل رخصت پر چلی گئی ہے جن کی بہو بیٹیاں بھرے سٹیڈیم میں "میری جان' فلاں خان" کے راگ اونچے سروں میں الاپتی ہیں اور یہ حضرات اپنے کانوں سے یا کم از کم ٹی وی سکرین پر اپنی لاڈلیوں کے نغمے ساعت فرما رہے ہوتے ہیں۔ مولوی بیچارے کی بہن' بیٹی اور بیوی ابھی اتنی "مہذب" نہیں ہوئی کہ وہ غیرت جیسی "غیرمہذب" عادت کو ترک کردے۔ اس تہذیب سے مولوی ابھی کوسوں دور ہیں اور ان "مسٹروں" کو ایسے "ایٹی کیٹ" کی کیا خبر؟

عورتوں کے حقوق مسلم ہیں' مولوی بھی مانتا ہے اور غیر مولوی بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولوی بیگمات کی خودساختہ فہرست حقوق کا قائل نہیں بلکہ اسلام کے دیئے ہوئے چارٹر کا قائل ہے اور عورتوں کے حقوق کے ضمن میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے دیئے ہوئے چارٹر سے بہتر کوئی دستاویز نہیں۔

ماڈرن عورت جس کو اپنا حق کہتی ہے وہ اس کا حق نہیں بلکہ سراسر ناحق ہے۔ آبرو کا تحفظ' گھر' نان نفقہ' عدل' تعلیم' حق مہر' کفالت' خلع' ملکیت' احساس شراکت وغیرہ۔ یہ خواتین کے حقوق ہیں۔ خدا اور رسولؐ خود ان حقوق کے محافظ ہیں۔ جو انہیں پامال کرے وہ خدا اور رسولؐ کا مجرم ہے۔ لیکن جینز کی پتلون پہننا' ہاکی کھیلنا' ڈانس فرمانا' بوائے فرینڈز ڈھونڈنا' فلموں میں کام کرنا' فضائی میزبان بننا' سیلز گرل شپ' ماڈلنگ وغیرہ!!.. یہ حقوق نہیں' آوارگی ہے۔ اسلام سنجیدہ لوگوں کا دین ہے' لہو و لعب نہیں کہ کھلنڈرے اس کے مفسر بن بیٹھیں۔ عورتوں کے حقوق ان لوگوں کے ہاتھ سے غیر محفوظ ہیں جو حقوق نسواں کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ عورتیں یا تو جاگیرداروں کی ہوس کی چکی میں پس رہی ہیں یا پھر افسروں اور سیاست کاروں کی بدمستی کی کورٹ میں گیند بنی ہوئی ہیں۔ کاروں کے فلیٹ کے ساتھ عورتوں کے "بیڑے" رکھنا جاگیرداروں کا وصف ہے' مولوی کا نہیں۔ "مائی فیوڈل لارڈ" کسی مولوی کی "رنگین داستان" نہیں' وڈیرے اور سیاست کار کی ہے۔ وزارت کے نئے قلمدان کے ساتھ نئی خاتون کا رواج ارباب منبر و محراب کی بستی میں نہیں' وڈیروں کے شہر میں ہے۔ "لیڈی سیکرٹری" دینی مدرسوں میں نہیں بلکہ سرمایہ داروں کی فرموں اور افسر شاہی کے دفتروں میں ہوتی ہے۔ گھر کی بیگم اور محفل کی بیگم کا طریقہ بڑے لوگوں کے ہاں رائج ہے اور مولوی ابھی اتنا "بڑا" کہاں بنا اور کب تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ یہ نخرے کرے۔؟

ہر اچھا انسان عورت کو تالے میں بند نہیں رکھنا چاہتا۔ اس کو اپنے فیلڈ میں اور فورم پر دیکھنا چاہتا ہے اور اسی کا نام عدل اور توازن ہے۔ "خودمختار" ہونا اور بات ہے اور "خودسر" ہونا دوسری بات۔ اچھے لوگ عورت کی خودمختاری کے قائل ہیں' خودسری کے نہیں۔ خودمختاری کا مطلب یہ ہے کہ جو میدان کار عورتوں کا ہے وہ خود سنبھالیں اور مرد اس میں مداخلت نہ کریں اور جو دائرہ عمل مرد کا ہے وہ اس کے اندر رہے۔ اسی لئے ہم خواتین کی تعلیم سے لیکر ملازمت اور مکمل تفریح تک میں ان کیلئے علیحدہ انتظام اور وسائل مہیا کرنے کے حامی ہیں تاکہ عورت زندگی سے بھرپور لطف بھی اٹھاسکے' اپنی صلاحیتوں کا اظہار بھی کرسکے' ملک و قوم کی خدمت بھی کرسکے اور اس کا نسوانی تقدس بھی مجروح نہ ہو۔ اگر اتنے بڑے انتظام کیلئے وسائل میسر نہیں تو جدوجہد کرنی چاہئے۔ بدحرامی اور فتورنیت اس مرض کا علاج نہیں کہ بات "آزاد روی" کی کہی جائے اور نتیجہ "بے راہ روی" پر ہو' یہ سراسر "ٹریپ" ہے۔ اس فریب کی قلعی کھلنی چاہئے ورنہ مغرب جیسے تہذیبی بحران کا ہمیں سامنا کرنا پڑے گا اور اللہ و رسول کی ناراضگی اس پر مستزاد!

آخر میں کہا گیا ہے کہ "وزیراعظم میاں نواز شریف نے معاشرے سے گھٹن اور حبس کی فضا ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اب معاشرہ آزاد ہوگا"... جی بسم اللہ' وزیراعظم کے منہ میں گھی شکر اور سردار صاحب کا بھی بے حد شکریہ کہ انہوں نے ہم تک وزیراعظم کا یہ نیک عزم پہنچایا ہے۔ لیکن گھٹن اور حبس کی تشریح ہونی چاہئے' ورنہ بات پھر الجھ جائے گی۔ ہمارے نزدیک اور ہر آدمی کے نزدیک گھٹن اور حبس سے مراد معاشرتی' معاشی اور سیاسی گھٹن اور حبس ہے۔ دیہات میں جاگیرداروں نے جاگیروں' اسلحہ' پالتو غنڈوں اور بدقماش عناصر کے زور پر معاشرتی گھٹن پیدا کر رکھی ہے۔ کوئی مزارع اپنی مرضی سے زمین آباد نہیں کرسکتا' بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتا' اپنی بہو بیٹی کو جاگیردار کے دربار میں حاضری سے مستثنیٰ نہیں کرسکتا' کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا' پکا مکان نہیں بنا سکتا اپنے طور پر نقل مکانی نہیں کرسکتا' ضمیر کے مطابق ووٹ نہیں دے سکتا' جاگیردار کے مخالف ووٹر سے رشتہ ناتا نہیں کرسکتا۔ یہ اور اس طرح کا بے پناہ جبر اس کے سر پر مسلط ہے جس کے نتیجے میں آزادی سے سانس لینا اس کیلئے دشوار ہوگیا ہے۔ شہروں میں سرمایہ داروں نے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان کے سر بفلک پلازوں نے ہر آدمی کو ہوس زر کا مریض بنادیا ہے۔ کاروں کی بھرمار نے ہر سائیکل سوار اور پیدل چلنے والے کو احساس کمتری کا روگ لگادیا ہے۔ ان اہل زر کے بگڑے ہوئے "شہ زادوں" نے شریف زادیوں کا بازار میں نکلنا دوبھر کر رکھا ہے۔ پیسے کی بہتات نے ہر چیز کو' حتیٰ کہ قانون کو بھی قابل خرید و فروخت بنا دیا ہے۔ منہگائی نے سانس تک لینے میں

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

فکر و نظر

مسلمانوں کے خلاف مغرب کی کامیاب منصوبہ بندی

ہمیں تو منصوبہ بندی کی مبادیات بھی معلوم نہیں

ڈاکٹر محبوب عالم خواجہ (مترجم: سردار اعوان)

جنگی بنیادوں پر منصوبہ بندی سے مراد ایسی منصوبہ بندی ہے جو پیش بینی پر منحصر اور حرکی نکتہ نگاہ کی حامل ہو' جس میں خصوصی ذرائع سے معلومات جمع کرنے پر اکتفا کرنے کی بجائے وسیع النظری سے کام لیا گیا ہو اور جو معاشرتی اور قومی مفادات کی نوعیت اور مواقع کا ہر لحاظ سے تعین کرتی ہو۔ اس میں ان مقاصد کے حصول کے لئے مطلوبہ ڈھانچہ بھی فراہم کیا جانا چاہئے۔ اس طرح کی منصوبہ بندی اب کسی ایسے فوجی اور دفاعی امور تک محدود نہیں رہی جن میں رازداری کی ضرورت پیش آتی ہو بلکہ یہ ایک کھلا علمی نوعیت کا شعبہ شمار ہوتا ہے اور اس کی باقاعدہ تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

ایک ایسا لائحہ عمل وضع کرنے کے لئے جو قومی امنگوں کا آئینہ دار ہو' منصوبہ سازی کی ضروریات پورا کرتا ہو' متبادل تجاویز کے ساتھ عملی خاکہ فراہم کرتا ہو اور مقرر کردہ ہدف کے بالمقابل کارکردگی کا جائزہ لینے کا طریقہ کار مہیا کیا گیا ہو' جنگی بنیادوں پر منصوبہ بندی کا محتاج ہوتا ہے۔ اس منصوبہ بندی سے آگے بڑھنے کا راستہ کھلتا ہے اور جو مقاصد طے پاتے ہیں ان کے حصول کے لئے ماہرین ایسا طریقہ کار مرتب کرتے ہیں جو معاشرہ کے معیارات اور ترجیحات سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہو۔ نیز ماہرین اور دیگر ذمہ دار حضرات جن معین کردہ مقاصد کو عملی روپ دینا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں ان کی حکمت عملی طے کرنے کے لئے وہاں کے معاشرتی' معاشی' سیاسی' دفاعی' مذہبی اور دیگر تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھنا نہایت اہم ہے تاکہ تمام متعلقہ گروہوں کی اس میں شرکت یقینی بنائی جاسکے۔ حکمت عملی اور اس پر عمل درآمد کا طریقہ کار ایسا ہونا چاہئے جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ یہ اصول پیش نظر رہنا چاہئے کہ کوئی بھی منصوبہ بندی تعصب اور ہٹ دھرمی کا شکار نہ ہونے پائے۔ ایک ماہر منصوبہ ساز کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ماضی' حال اور مستقبل' تینوں پر اس کی گہری نگاہ ہو۔

جنگی بنیادوں پر منصوبہ بندی کا مقصد ممد و معاون شعبوں' ان کے کردار' مسائل کی نشاندہی اور مؤثر جانچ پڑتال کے ذریعے سے ایسے نئے مواقع پیدا کرنا ہوتا ہے جن سے ترجیحات' تبدیلی اور ترقی کے راستے کھلیں۔

تمام عالمی منصوبے دوسری قوموں پر اپنا معاشی' سیاسی اور مذہبی تسلط قائم کرنے کی غرض سے وضع کئے جاتے ہیں۔ ماہرین ابلاغ عامہ' چرچ' معاشی نظام اور دیگر اہم اداروں کو مدنظر رکھ کر سست کا تعین کرتے ہیں اور ایسے اصول ترتیب دیتے ہیں کہ تمام حلقوں کی عملی شرکت یقینی بنائی جاسکے' نہ صرف منصوبہ بندی اور ترقیات کے ادارے معاشرے کی مختلف سطحوں پر جاری منصوبوں سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کے لئے نگہداشت کا کام انجام دیتے ہیں بلکہ تمام اہم گروہ اس کام کو اولیت دیتے ہیں۔ مغرب میں مشترکہ قومی مفادات کے حصول اور ترجیحات مقرر کرنے میں رائے عامہ کو حد درجہ اہمیت دی جاتی ہے۔ یورپ پر ایک نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ سماجی و سیاسی طور پر ایک دوسرے کے مخالف لوگ بھی معاشی اور سیاسی میدان میں بالکل یکجا ہیں۔ مفاد عامہ کے لئے "ماسٹرچ معاہدہ" مغربی یورپ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے' اس کے برعکس جن ممالک میں نظریاتی ہم آہنگی کا فقدان ہے اور لوگ بے بسی کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں' وہاں مشترک مفادات اور باہمی قربت تو دور کی بات ہے آپس میں میل جول کی کیفیت بھی باقی نہیں رہتی۔

کیمونسٹ ممالک میں منصوبہ بندی کا شعبہ اہم ترین شعبہ خیال کیا جاتا تھا مگر یہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر ثابت ہوا۔ جو لوگ حقیقی جمہوری قدروں اور استدلال کو غیر ضروری سمجھتے ہیں' انہیں ایک "سپرپاور" کے بکھرنے سے نصیحت حاصل کرنا چاہئے۔ دوسری جانب مغربی ماہرین اور تجزیہ نگاروں کی کوتاہ نظری بھی قابل دید ہے جنہیں سویت یونین کے اچانک زمین پر آگرنے کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ ہوسکا اور وہ بدستور تصادم کی پالیسی اپنائے رہے۔ ان کی نگاہ میں طاقت اور توانائی کے مادی معیارات تھے۔ ماضی کی کسی "سپرپاور" کی خصوصیات کو تاریخ کے گمشدہ اوراق میں تلاش کیا جاسکتا ہے تاہم آج ہم "سپرپاور" اس کو سمجھتے ہیں جسے ان مادی اسباب و وسائل حاصل ہوں جو کسی بھی وقت دھوکہ دے سکتے ہیں۔ اس بناء پر کسی کو "سپرپاور" قرار دینا کیا احمقانہ بات نہیں؟ کیا ماہرین حالیہ واقعات سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کریں گے؟ لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی جواز پیدا کرکے مکھی پر مکھی مارنے کا عمل جاری رکھا جاتا ہے اور انہی کتابی باتوں کو حقیقت کا رنگ دے کر پیش کردیا جاتا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ماہرین اور دانشور حضرات اپنی کارکردگی اور اصل ذمہ داریوں کا نئے سرے سے جائزہ لیں تاکہ حقیقت پسندانہ بنیادوں پر کام کا آغاز کیا جاسکے۔ مسلم ممالک کے بارے میں تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں' خود ہی اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ لیں۔ ایک سیدھا سادہ اصول ہے کہ "پہلے تولو پھر بولو" ہمارے مسلمان سیاست دان' دانش ور اور ماہرین کہاں تک اس کا اہتمام کرتے ہیں' کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

مفاد عامہ کے امور میں شورائیت کا اہتمام ایک مسلم معاشرہ میں واجب کا درجہ رکھتا ہے۔ قرآن کی رو سے شورائیت سے مقصود تعمیر و ترقی اور عوامی بہبود کے کاموں کے لئے ہم آہنگی اور باہم اعتماد کی فضا پیدا کرنا ہے تاکہ ایک قابل فہم ڈھانچہ فراہم ہو اور ایسے ادارے وجود میں آئیں جنہیں حکمت عملی تیار کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے کا کام سونپا جاسکے۔ اسلام کے اولیں دور میں "شورائیت" کا مفہوم ایک طرز حکومت اور عوام سے متعلقہ شعبوں میں حکومت کا طرز عمل تھا۔ ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ حق وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے

اور جب بھی اس پر تکیہ کیا جائے گا تو حق ہی غالب ہوگا اور علم کی قدر و قیمت یہ ہے کہ اس پر عمل ہو۔ حقیقی علم مسلمانوں کے پاس ہے' باقی سب قیاس آرائیاں ہیں "ایسے لوگوں کی پیروی مت کرو جن کو صحیح علم حاصل نہیں" (سورۂ یونس ۸۹) "جن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے ان کی بات نہ مانو' وہ لوگ جو اپنی خواہشات کے بندے ہیں' جنہوں نے ساری حدود توڑ ڈالیں" (! الکہف ۲۸)۔ ذرا سوچئے! مسلم ماہرین اور دانشور اسلامی اصولوں کو رہنما بنا کر حکمت عملیاں تیار کریں تو کیا ان کی حالت وہی رہے گی جو اب ہے؟

دین ایک' امت ایک' تمام مسلمان ایک' ان کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے جو مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے' اس کے باوجود ہمارے پالیسی ساز ادارے یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ امت کی بھلائی کیسے ہو۔ جو شے آج امت کے لئے مفید ہے' وہی کل بھی مفید ہوگی' اگلے سال بھی اور اس سے اگلے سال بھی۔ اس سے زیادہ آسان راہ کوئی اور ہو سکتی ہے! بشرطیکہ ہمیں یقین ہو' پوری نوع انسانی کا اسی میں بھلا ہے' مسلمان حامل قرآن ہونے کے ناطے احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہوں تو ان کا کام ہی دوسروں کو نیکی کا حکم دینا' بدی سے روکنا اور معاشرے کو اسلامی اصولوں اور معمولات کے مطابق استوار کرنا ہے لیکن مسلمان ماہرین اور اسکالرز کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خود مسلمانوں پر اثر انداز ہونے والے بدلتے ہوئے حالات سے بھی آگاہی نہیں جبکہ زمانہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آگے جا رہا ہے۔ گذشتہ چند ایک سال سے پوری دنیا میں زبردست تبدیلی آ رہی ہے۔ سوویت یونین میں انسان کا پیش کردہ اتنا بڑا نظام زمین بوس ہو کر رہا مگر ہمیں پھر بھی کوئی روشنی نہیں ملی۔ بجائے اس کے کہ ہم دنیا کو اللہ کے دیئے ہوئے نظام کی طرف توجہ دلائیں' ہم بدستور ان کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ ہم جن مغربی نظریات کی مرعوبیت کا شکار ہیں' وہ نرے دھوکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں دنیا میں جو کچھ رونما ہو رہا ہے' وہ یورپ کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ ایسا قطعاً نہیں۔

مغربی ممالک نے مسلمانوں کے بارے میں جو حکمت عملی اپنا رکھی ہے' وہ چوہے بلی کا کھیل ہے۔ انہیں مسلمانوں کے ردعمل کا پہلے سے اندازہ ہوتا ہے کیونکہ مسلمان انہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ درحقیقت ذہنی طور پر ہم پہلے سے کہیں زیادہ مغرب کے غلام بن چکے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب عوام کو دھوکہ دینے کے لئے ہمارے اپنے مسلمان حکمران اور دانشور ہم پر مسلط ہیں۔ مسلمان بحیثیت امت بے پناہ وسائل رکھتے ہیں جنہیں بروئے کار لایا جائے تو امت کی تقدیر بدل جائے مگر جن کے ہاتھوں میں امت کی باگ ڈور ہے' وہ خود مغربی تہذیب کے ذہنی غلام ہیں۔ اگر غور کریں تو صاف نظر آئے گا کہ مسلمانوں کے جان' مال' عزت اور آبرو کی خاطر کوئی حکمت عملی تیار کرنے کی ہم ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

ہم سمجھتے ہیں مغرب میں اتنا کام ہو رہا ہے کہ اس کا بچا کھچا ہی ہمارے لئے بہت ہے اور نہیں تو "انسانی ہمدردی" کی بنیاد پر تو کچھ مل ہی جائے گا۔ ہمارے غیر ملکی مشیر سطحی قسم کی تبدیلیوں کے ذریعے کام چلانے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں تاکہ ایک مصنوعی "توازن" قائم رہے اور اصل مسائل نظروں سے اوجھل رہیں۔ امت مسلمہ کے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے' مواقع حاصل ہیں' وسائل کی کمی نہیں مگر ذہن سیکولر ہیں جس کی وجہ سے قدم نہیں اٹھتے۔ بقول مولانا سوودودی مرحوم' اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ انہیں اسلام کی تعلیم ہی نہیں ملی جبکہ غیر مسلم اپنی علمی برتری قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ان کے پاس ہے۔ ہم ان کے اشاروں پر چلنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ ہم نے غیر ملکی نظریات اپنا کر غیروں کی دخل اندازی کے لئے راہ ہموار کر رکھی ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ کوئی نہ کوئی شوشہ ایسا چھوڑ دیتے ہیں جس سے نظر آئے کہ مسلم ممالک اپنے ہاں ترقیاتی اور دفاعی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ سب سے زیادہ تعلیمی اور تربیتی پروگرام ان کی نظر میں رہتے ہیں۔ کئی سال سے یہ تماشہ ہو رہا ہے۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ غیر ملکی ماہرین کا ترتیب دیا ہوا یہ تعلیمی نظام گل کھلا رہا ہے؟ ہم مستقلاً دوسروں کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ہم پیچھے مڑ کر یہ دیکھنے کو تیار نہیں ہیں کہ آیا ہم واقعۃً آگے بڑھ رہے ہیں یا درحقیقت پیچھے لڑھک رہے ہیں۔ آزادی کے بعد ہم نے کون سے شعبے میں کوئی ٹھوس پیش رفت کی ہے۔ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ذہنی طور پر ناکارہ بنا کر دنیا سے ہمیں نیست و نابود کرنے کی سازش پروان چڑھائی جا رہی ہو؟

کمیونزم کا خاتمہ ہوا ہے تو ہمیں جدید دور کے تقاضوں پر پورا اترنے کے لئے سیکولرزم کے علاوہ کوئی راہ ہی دکھائی نہیں دیتی۔ ہمیں دانستہ صدام' سلمان رشدی' قذافی' حافظ الاسد' مرزائیت' فٹ بال کے میچوں اور ٹیکنالوجی کی منتقلی جیسے چکروں میں ڈالا گیا ہے تاکہ کسی کو بوسنیا کے مسلمانوں کا منظم طور پر صفایا' کشمیریوں کا قتل عام اور فلسطینیوں کی حالت زار کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہو۔ ہمارے دانش ور ہفتہ وار فٹ بال میچ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ عالمی سطح پر ہماری حیثیت بڑی طاقتوں کے مہروں سے زیادہ نہیں۔

ہماری نجات اس میں ہے کہ پوری امت کے مفادات کو مدنظر رکھ کر حکمت عملی تیار کریں لیکن ہم علاقائی' وطنی اور قومیتوں کی بنیاد پر تقسیم ہوئے بیٹھے ہیں۔ مغربی دنیا نے بلاشبہ تمام علوم' فنون مسلمانوں سے سیکھے اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے پناہ ترقی کی مگر ایک مسلمان کا معاملہ مختلف ہے۔ آج ہم اسی طرح مغرب سے علوم و فنون سیکھ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے جس طرح مغرب نے کیا تھا کیونکہ ہم سب کو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا اپنا عہد پورا کرنا ہوگا۔ کوئی قوم اپنی معاشرتی اقدار نظرانداز کر کے جدید علوم سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ دیگر اقوام اخلاقی طور پر اس طرح کے کسی عہد کی پابند نہیں لیکن ہم اسلام سے روگردانی کر کے فی الحقیقت منافقت کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے سامنے مغربی اطوار زندگی کتنے ہی مثالی کیوں نہ ہوں' امت مسلمہ کی اصلاح کے تقاضے جدا ہیں۔

مسلمانوں کی اکثریت کو ان کے گھروں سے بے دخل کیا جا رہا ہے' ان پر دنیا بھر کے مظالم توڑے جا رہے ہیں' انہیں بے دردی سے قتل کیا جا رہا ہے اور مسلم ممالک عالی شان عمارتیں' بڑے بڑے ہوائی اڈے' کاروباری مراکز' اسپورٹس کمپلیکس اور عیاشی کے اڈے تعمیر کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے حکمران بے معنی بیانات جاری کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں جو لوگ کچھ کرنے کے قائل ہیں وہ اپنے سجے سجائے محلات' تفریح گاہوں اور خوش گپیوں میں مگن ہیں لیکن یاد رکھئے اب وہ وقت دور نہیں جب یہ تھوڑی سی مہلت' جو ہمیں اس وقت میسر ہے' باقی نہیں رہے گی۔ کوئی قوم جب عقل و دانش کی راہ پر آنے کو بالکل تیار نہ ہو تو وہ اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔ کیا اس وقت پوری امت مسلمہ ایک دوراہے پر نہیں کھڑی ہے؟○○

پی ٹی وی کا کٹہرا

محمد سمیع کراچی

مولانا کوثر نیازی نے بہت اچھا کیا جو ملک کے ممتاز سیاست دانوں کو ٹیلی ویژن کے "کٹہرے" میں کھڑا کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ "ممتاز سیاست دان" ہی وہ حضرات ہیں جنہوں نے جب کبھی وطن عزیز میں جمہوریت کو آگے بڑھتے دیکھا' اس کھیل میں فاؤل پلے کیا اور ملک میں بار بار مارشل لاء لانے کا سبب بنے جس کے نتیجے میں ملک دو لخت ہوا اور مزید ٹکڑے ہونے کا اندیشہ ہمہ وقت موجود ہے۔ عدالت عظمیٰ کے فیصلے کی روشنی میں جناب صدر کے اقدامات کالعدم قرار پاجانے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ مولانا خود کب اس "کٹہرے" میں پیش ہوتے ہیں۔

محترم المقام مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کو اپنی نوعیت کے آخری ثابت ہونے والے پروگرام میں اس کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ مولانا موصوف نہ صرف یہ کہ ایک مستند عالم دین ہیں بلکہ ملکی سیاست میں ان کو ایک اہم مقام بھی حاصل ہے۔ ان کے پروگرام کو دیکھنے کے بعد جو تاثرات میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے' وہ نوک قلم پہ آنے کو بے تاب ہیں ورنہ پہلے دو پروگراموں سے تو کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔

ہمیں مولانا کی دیانت کا تو اعتراف ہے کہ انہوں نے اپنی جماعت کا مقصد جمہوریت کی خدمت بتایا ہے' دین کے غلبہ کی جدوجہد نہیں ورنہ ان سے سوال کیا جاسکتا تھا کہ اگر آپ کی جماعت کا مقصد دین کا غلبہ ہے تو یہ صرف امت کے ایک ہی فرقے کی نمائندگی کیوں کرتی ہے۔ دراصل انہوں نے اپنی جماعت میں دین کی دعوت کو وہ مقام دیا ہی نہیں جس کی وہ مستحق ہے۔ انہوں نے بڑے فخر سے یہ بتایا کہ ورلڈ اسلامک مشن کے تحت انہوں نے یورپ' امریکہ اور افریقہ کے مختلف مقامات پر مساجد کے سنگ بنیاد رکھے' اسلامک سنٹر قائم کئے اور مدرسوں کا آغاز کیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اتنا ہی کر دینا کافی ہے اور اس کا استحقاق بھی انہوں نے غیر ممالک کے باشندوں کو عطا کیا اور جواب اس کا یہ ہے کہ ہماری ان دینی اور مذہبی جماعتوں کی جو انتخابی سیاست میں حصہ لے رہی ہیں' کمزوری یہی ہے کہ ان کی توانائیوں کا بیشتر حصہ آج کی مکار سیاست میں صرف ہو رہا ہے۔ دعوت دین کو انہوں نے ایک جزوقتی کام سمجھ لیا ہے۔ موڈ میں آئے تو دعوت قرآنی کی مہم چلادی' ہفتہ اتحاد و منکرات منالیا' بس اللہ اللہ خیر سلا حالانکہ حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے انہیں اپنی توانائیوں کو دعوت رجوع الی القرآن پر صرف کرنا چاہئے تھا۔ جب لوگوں میں قرآن کا پیغام عام ہوگا ہی نہیں تو انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ ان کے ووٹ کے اصل حقدار کون ہیں۔

رہا وسائل کا معاملہ تو الحمدللہ کہ آغاز اسلام کے وقت جو وسائل میسر تھے اس کے مقابلے میں آج ہمیں کہیں زیادہ وسائل میسر ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم دین کے لئے کام کرنے کا کتنا جذبہ رکھتے ہیں اور کتنی قربانیاں اس راستے میں دینے کیلئے تیار ہیں۔ مولانا نے اپنی جماعت کی نگراں حکومت میں شمولیت کا جو جواز پیش کیا' وہ منطقی طور پر تو درست ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کی جماعت کی نگراں حکومت میں شمولیت کے بغیر قانونی تقاضے پورے نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کی جماعت حکومت سے باہر رہ کر بھی اس کی حمایت کرسکتی تھی اور یہ تو مولانا کی عمومی روش رہی ہے کہ وہ اتحادوں میں شریک ہوئے بغیر باہر ہی سے ان کے حامی رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بحالی جمہوریت کی تحریک جس میں ان کی جماعت کبھی شامل نہیں ہوئی' البتہ باہر رہ کر اس کی حمایت کی۔ مولانا کی جماعت ایک اصولی جماعت ہے اور اس جماعت کا اس نگراں حکومت میں شامل ہونا جس کا کرتا دھرتا غلام اسحٰق خاں جیسا شخص تھا اور جس کے کرتوت عوام کے سامنے الم نشرح ہو کر سامنے آگئے ہیں' کیا تعاون علی البر قرار دیا جاسکتا ہے؟

اب آیئے کوٹہ سسٹم کے بارے میں ان کے فرمودات پر غور کرتے ہیں۔ ان کی جماعت نے بہت ہی اچھا کیا کہ ۷۳ء کے آئین میں کوٹہ سسٹم کے معاملے پر اختلافی نوٹ لکھا۔ ان کا یہ فرمانا بھی بجا ہے کہ کوٹہ سسٹم اگر اتنا ہی ضروری ہے تو پورے ملک پر اس کا نفاذ کیوں نہ ہو اور یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ کوٹہ سسٹم سے فائدہ ہندو اقلیت کو ہو رہا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی جماعت نے اس بارے میں دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر کوئی متفقہ لائحہ عمل تیار کیا؟ کبھی کوئی تحریک چلانے کی سوچی۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ شہری اور دیہی آبادی کے نمائندہ افراد افہام و تفہیم کی فضا میں بیٹھ کر اس پر غور کریں۔ بظاہر یہ بڑی ہی معقول تجویز ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے جو فضا صوبہ سندھ میں قائم ہے' کیا اس میں ایسا ممکن ہے؟ کیا وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ سندھ کے شہری اور دیہی عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کوئی کردار ادا کرسکیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر بسم اللہ کریں لیکن ہمارے دینی اور مذہبی عناصر نے تو لسانی تحریکوں کے ساتھ مخاصمت کا راستہ اختیار کیا۔ بجائے اس کے کہ انہیں اعتماد میں لیتے اور نتیجے میں اپنی شہری نمائندگی بھی کھودی۔ اگر دین کا پرچار کرنے والے انتہاپسند عناصر میں افہام و تفہیم پیدا نہیں کرسکتے تو معاشرے کا اور کون سا گروہ ایسا ہے جو اس فریضہ کی انجام دہی میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ صرف قرار دادیں پاس کرنے اور بیانات دے دینے سے تو کوٹہ سسٹم ختم نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ٹھوس اقدامات ناگزیر ہیں اور اس معاملے میں قوم کو سیاست دانوں سے کوئی توقع نہیں۔ دینی عناصر ہی یہ فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

یہ سوال آج کل ہر ذہن میں موجود ہے کہ جب ہمارا دین ایک' اللہ ایک' رسولؐ ایک اور قرآن ایک ہے تو دینی عناصر آپس میں کیوں تفرقے میں پڑے ہوئے ہیں؟ مولانا سے بھی یہ سوال کیا گیا لیکن انہوں نے بھی دوسروں کی طرح اس سوال کا کوئی مثبت جواب دینے کی بجائے اسے خوبصورتی سے ٹال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعتوں کا قیام اس قدر روز افزوں ہے کہ اب خود جید علماء بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ جماعت بندی ایک فتنہ بن گئی ہے لیکن ان کے اس قول نے عوام کے ذہنوں میں انتشار پیدا کر رکھا ہے جو خود ایک فتنہ ہے۔ قرآن کریم نے اس کی وجہ آپس کی ضدم ضدا بتائی ہے لیکن علماء بھلا اس کا اعتراف کیسے کرسکتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش میں ملوث ہیں۔ حیرت ہے کہ جب قرآن کریم اہل کتاب سے مشترک باتوں میں تعاون کی اپیل کرتا ہے اور آج کے دور میں علماء مشترک معاملات میں سیکولر عناصر تک سے سیاسی اتحاد کرسکتے ہیں تو دین کے معاملے میں یہ رویہ کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ علماء کو چاہئے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مسئلہ کا حل نکالیں جو عوام کو دین سے اور دینی عناصر سے متنفر کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ ○○

بقیہ گل فشانی گفتار

کفایت پر مجبور کردیا ہے۔ ڈاکے اور لوٹ مار نے راتوں کا سکون اور دن کا آرام چاٹ لیا ہے۔ ہر محکمے نے ہر شہری کو ذلیل کرکے رکھ دیا ہے۔ رشوت اور سفارش نے جائز و ناجائز کے تمام امتیازات ختم کر ڈالے ہیں۔ شادی بیاہ کی امیرانہ رسموں نے متوسط طبقے کا بھرکس نکال دیا ہے۔ "گلبرگیرین" کلاس نے ہر دوسرے آدمی کو ڈپریشن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ٹریفک کا بے ہنگم سلسلہ اور پولیس کا بے رحم رویہ عوام پر تازیانہ غضب سے کم نہیں۔۔ یہ ہے وہ گھٹن اور حبس جس کا ہر دیہاتی اور شہری شکار ہے۔ سیاسی لوگوں کا جوڑتوڑ اور سیاسی اداروں کا عدم استحکام اس گھٹن اور حبس میں آئے روز اضافہ کررہا ہے اور ہر فرد اپنی جگہ بے یقینی کا ایک نمونہ بنا ہوا ہے اگر اس گھٹن اور حبس کا خاتمہ مطلوب ہے تو ہر شخص بقدر استطاعت اس مہم میں حصہ لینے کو تیار اور مستعد ہے اور وزیراعظم اس اقدام میں خود کو اکیلا نہیں بلکہ کروڑوں عوام کو اپنا ہمنوا سمجھیں بشرطیکہ وہ خود گھٹن پیدا کرنے والے عناصر کے دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور کسی سیاسی و معاشرتی مصلحت کو آڑے نہ آنے دیں۔ اگر وزیر موصوف کے بیان کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے اور جس پس منظر اور ماحول میں تقریر کی گئی ہے اس کو جانچا جائے تو گھٹن اور حبس سے مراد کچھ اور ہے اور وہ وہی گھٹن اور حبس ہے جس کی فریاد برسوں سے مراعات یافتہ اور عیش پرورہ اور کسی حد تک حواس باختہ طبقہ کررہا ہے یعنی ٹی وی زیادہ سے زیادہ "اوپن" ہو، عورت کو نئے دور کے آداب اور تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے، ریس اور شراب پر عائد پابندی ختم کی جائے، حکومتی اداروں، اسمبلیوں، مشاورتی کمیٹیوں اور تعلیمی کونسلوں سے "مولویوں" کا دخل عمل کم بلکہ ختم کیا جائے۔۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مطالبے اور تقاضے!۔۔ یہ اگر گھٹن ہے تو یہ ابھی رہے گی، یہ حبس ہے تو کچھ دیر چلے گا۔ جب تک معاشرے میں زندگی کی رمق ہے، وہ آوارگی کی مزاحمت کرے گا اور ٹھنڈے پیٹوں تہذیب مغرب کو ہضم نہیں کرے گا۔

یہ مژدہ جانفزا ابھی دیا گیا ہے کہ "اب معاشرہ آزاد ہوگا"

۔۔۔ لیکن وزیر موصوف کے تیور تو یہ بتاتے ہیں کہ یہ نوید "مادر پدر آزاد" معاشرے کی سنائی جارہی ہے جہاں ہر شخص کا اپنا رخ ہوگا اور اپنا قبلہ، ہر قید اور بندش سے آزاد، لٹیروں کو لوٹ مار کرنے کی آزادی اور قاتلوں کو جان لینے کی آزادی، حتیٰ کہ غداروں کو ملک توڑنے کی آزادی۔ یہ تصور آزاد معاشرے کا نہیں، "عدم آزاد" معاشرے کا ہے۔ اس لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہمیں آزاد معاشرہ تو درکار ہے لیکن "مادر پدر آزاد" معاشرہ ہرگز مطلوب نہیں۔

بقیہ جناب نعیم صدیقی

کیا کہ میں آپ کو پریس لگوا کے دے سکتا ہوں، قیمت کئی سال کی قسطوں میں دیجئے گا اور یہی بات میرے گھر میں چائے پیتے ہوئے کسی بینک کے ایک سندھی مینیجر نے کہی کہ میرا تبادلہ ہونے والا ہے اور آپس کے تعلقات کی بناء پر میں یہ پیشکش کرتا ہوں کہ اپنے لئے یا اپنے کسی خاص دوست کے لئے لاکھ دو لاکھ روپیہ قرض لینا ہو تو میں بغیر کسی ضمانت یا کفالت کے مہیا کرسکتا ہوں، میں نے دونوں کو جواب دیا کہ ان جھمیلوں میں معاملہ سود کا پڑتا ہے، لہٰذا بہ شکریہ معذرت۔

اس پاگل نے کیا کیا نہ کیا، ایک دفعہ کراچی سے گاڑی پر روانہ ہوا تو دیا سلائی پاس نہ تھی ۲۰ ۲۲ سگریٹ روزانہ پینے والے کو دیا سلائی نہ مل سکی۔ کیونکہ ہمارا ڈبہ انجن کے ساتھ تھا اور خیرپور میل یا کوئی تیز گاڑی منٹ دو منٹ سے زیادہ اکثر اسٹیشنوں پر نہیں رکتی اور کوئی خوانچے والا قریب نہ پہنچتا، اترنے میں بھیڑ بھڑکا بھی حائل اور گاڑی چلنے کا بھی دھڑکا۔ کسی دوسرے مسافر سے میں نے دیا سلائی مانگنا پسند نہ کیا، اس میں ۲۴ گھنٹے گزر گئے۔

پھر ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جلال پور جٹاں کے ایک پرانے دوست میرے برطانیہ جانے پر کسی شہر میں ملے۔ دوستوں کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے، گپ شپ کے بعد چلنے لگے، تو دوستوں سے کہا کہ آپ لوگ ذرا باہر کو چلے جائیں، مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے، جب وہ چلے گئے تو انہوں نے جیب سے چیک بک نکالی اور کھول کر سامنے رکھی، قلم نکال کے سامنے کیا اور فرمایا کہ جو رقم آپ چاہیں لکھ لیں، میری طرف سے ہدیہ! میں نے اس دوست کی بلندی دیکھ کر سوچا کہ میں اس مقام سے پست تر نہ ہوجاؤں، میں نے ان سے کہا چیک بک جیب میں رکھ لیجئے، آمدورفت کا کرایہ یہاں سے دیا گیا ہے، اندرونی سفر بھی احباب لندن کراتے ہیں، کھانے کا انتظام بھی ہے لہٰذا آپ تکلف نہ کریں، مجھے میری درویشی کافی ہے۔ اس گئے گزرے اور ترک آمدورفت اور کئی ربط و ضبط کے دور میں میرے کئی ایسے احباب موجود ہیں، جن کو جس بھی مناسب رقم کی تکلیف دینا چاہوں، وہ بصد شوق لبیک کہیں گے مگر میں نے زندگی بھر یہ کام اس لئے نہیں کیا کہ میں لوگوں سے پیسہ سمیٹتا پھروں، خدا نے کبھی تھوڑی سی تنگی کے ساتھ اور کبھی کشائش کے ساتھ مجھے اس قدر نوازا ہے کہ میں تو اس کا شکر بھی کماحقہ ادا نہیں کرسکتا۔ کجا کہ مزید بار دولت و آسائش اپنے اوپر لادتا چلا جاؤں۔ اس نے ساری عمر رزق حلال دیا، حرام سے بچایا اور اسی کی برکت سے صدق مقال کی دولت دی، اکل حلال اور صدق مقال یا خودی اور ضمیر کی زندگی کتنی بڑی عطا ہے۔

ویسے جو طرح طرح کی گھاٹیاں اور پیچ و خم اس راستے میں آتے ہیں، ان کا پیشگی خیال کرکے خیرخواہوں نے بہت سمجھایا، خود میں نے بار بار کترا جانے کا جواز تلاش کیا مگر۔

اب تو ہے اور ہم ہیں، اے کوچہ ملامت!
چاہا کہ بچ کے نکلیں، یہ دل مگر نہ مانا

اب جب کوچہ ملامت کو قبول کرلیا تو تین پیسے کا آدمی بھی جو بدگوئی اور بدسلوکی چاہے کرسکتا ہے، کل کے چھوکرے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تحریک اسلامی کو وہ مولانا مودودی سے بڑھ کر جانتے ہیں اور ہمارے متعلق ان کا خیال ہے کہ چند رجعت پسندانہ جامد خیالات ان لوگوں کا سرمایہ ہیں تو یہ ہے سزائے عاشقی!

بقیہ گاہے گاہے باز خواں

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا۔ یہ اعلان کہ: لا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين۔

آج کی صحبت ختم ہوگئی، مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں، اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گردوپیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ والسلام علیکم۔ ○○

امریکی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

ایک دلچسپ سروے رپورٹ جس کا سب سے نمایاں پہلو "لاتعلقی" ہے

امریکی اخبار لاس اینجلیس ٹائمز نے اپنی اشاعت ۶/اپریل ۱۹۹۳ء میں ایک رائے شماری کا نتیجہ شائع کیا ہے جس کا موضوع اسلام اور مسلمان تھے۔ اخبار کا کہنا ہے کہ ۱۲۷۳ بالغ خواتین و حضرات سے سوالات کئے گئے اور جوابات میں اکثریت "نہیں معلوم" کی تھی۔

* اس سوال کے جواب میں کہ "جس مذہب کو اسلام کا نام دیا جاتا ہے، اس کے بارے میں آپ کا تصور کیا ہے؟" ___ ۶۴ فی صد نے کہا کہ ہمیں کچھ خبر ہی نہیں، ۲۲ فی صد کا جواب بیزاری کا مظہر تھا اور صرف ۱۴ فی صد نے اسلام کے لئے کلمہ خیر کہا۔

* ایک سوال تھا "آپ کے خیال میں اسلام مغربی انداز کی جمہوری سیاست سے مطابقت رکھتا ہے یا بنیادی طور پر وہ ایک غیر جمہوری مذہب ہے؟" ___ ۴۹ فی صد نے لاعلمی ظاہر کی، ۴۱ فی صد نے کہا کہ اسلام کا جمہوریت سے کیا واسطہ اور صرف دس فی صد سمجھتے ہیں کہ اسلام اور جمہوریت کا ساتھ نبھ سکتا ہے۔

* "اسلام امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کی سلامتی کے لئے کوئی خطرہ تو نہیں؟" کے جواب میں ۳۴ فی صد نے بے خبری کی اوٹ لی، ۳۷ فی صد نے کہا کہ کوئی خطرہ نہیں اور ۲۹ فی صد کے خیال میں اسلام خطرے کا نشان ہے۔

* "آپ اسلام نامی مذہب کے بارے میں سوچیں تو دھیان کس طرف کو جاتا ہے" ___ ۱۶ فی صد نے کہا کہ "مشرق وسطیٰ کی طرف"۔ نو فی صد کا ذہن عرب ممالک کی طرف منتقل ہوا۔ سات فی صد کا خیال انتہا پسندوں اور فدائیوں کی طرف گیا۔ چھ فی صد نے تشدد اور دہشت گردی کا عنوان جمایا۔ تین فی صد کی توجہ ایران کی طرف مبذول ہوئی۔ تین فی صد کے حافظے میں میلکم ایکس ابھرا۔ تین فی صد کو کالے امریکی یاد آئے۔ دو فی صد نے بنیاد پرستوں کا سوچا۔ دو فی صد کے دل نے عظمت اسلام کی گواہی دی۔ دو فی صد کا خیال اللہ تعالیٰ کی طرف گیا۔ ۳۰ فی صد جوابات متفرق تھے۔ جبکہ ۳۷ فی صد لاعلمی کا شکار تھے۔

* اس وضاحت کے ساتھ کہ امریکی مسلمانوں میں ۵۶ فی صد باہر سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہیں اور باقی ۴۴ فی صد پرانے امریکی ہیں اور یہ بتانے کے بعد کہ مسلمانوں کی آبادی کا ارتکاز سب سے زیادہ کیلیفورنیا، نیویارک، الی نوائے اور نیو جرسی ریاستوں میں ہے، سوال کیا گیا کہ آپ کے خیال میں امریکی مسلمان افریقہ سے آئے ہوئے امریکیوں پر مشتمل ہیں۔ ۲۶ء۴ فی صد نے انہیں جنوبی ایشیائی یا جنوب مشرقی ایشیائی قرار دیا۔ ۱۲ء۴ فی صد کے نزدیک وہ عرب ہیں۔ ۵ء۲ فی صد کے خیال میں وہ تازہ وارد افریقی ہیں۔ ۳ء۶ فی صد انہیں ایرانی سمجھتے ہیں۔ ۲ء۴ فی صد نے انہیں ترک جانا۔ ۱ء۶ فی صد انہیں یورپ سے آنے والے امریکیوں کے طور پر جانتے ہیں اور ۵ء۶ فی صد نے متفرق جوابات دیئے۔ ○○

The Times Poll

What Do We Think of Islam?

The Times polled 1,273 adults nationwide on Feb. 18-19 regarding their views on Islam. "Not aware" or "don't know" were common responses to the questions.*

■ **What is your impression of the religion called Islam?**

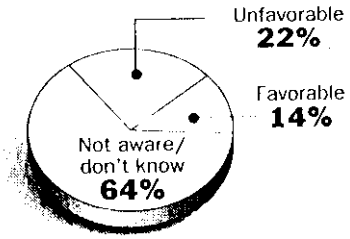

■ **Do you think the religion called Islam is compatible with Western-style political democracy or is it basically an anti-democratic religion?**

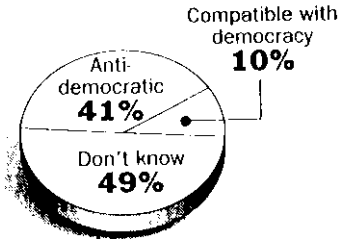

■ **Do you think the religion called Islam poses a threat to the security of the United States and its Western allies or not?**

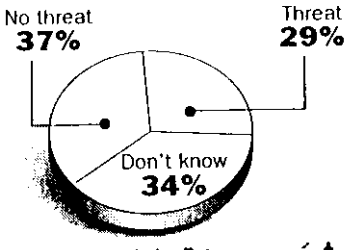

■ **When you think of the religion called Islam, what comes to your mind?****

Middle East	16%
Arab countries	9%
Fanatics/zealots	7%
Violence/terrorism	6%
Iran	3%
Malcolm X	3%
Black Muslims in U.S.	3%
Fundamentalism	2%
Great religion	2%
Allah	2%
Other answers	30%
Nothing/don't know	37%

* Margin of sampling error is plus or minus 3 percentage points
** Accepted up to two replies

Who Are the American Muslims?

Immigrants constitute 56% of the U.S. Muslim population; 44% is indigenous. States with the highest concentrations are California, New York, Illinois and New Jersey.

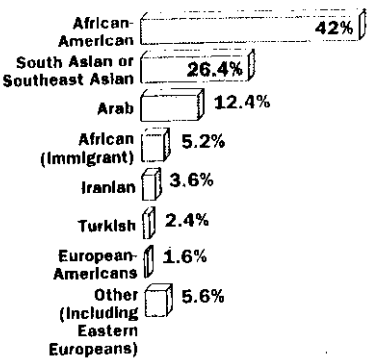

Source: American Muslim Council

VICKY McCARGAR / Los Angeles Times

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

اقبال اور مودودی کے اسلام الگ الگ نہیں ہیں

لاہور، ۲۱ مئی۔ تنظیم اسلامی کے امیر اور تحریک خلافت پاکستان کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا آنا تقدیر الٰہی ہے، لیکن کسی لطیفہ غیبی کے ذریعے آنے کی بجائے یہ ہمیں ابتلاء و آزمائش سے دوچار کرنے کے بعد آئے گا جس کے آثار بالکل سامنے نظر آ رہے ہیں۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اپنے خطاب جمعہ میں انہوں نے کہا امریکہ کھل کر ہماری مخالفت پر اتر آیا ہے، جبکہ بھارت کی ازلی مخاصمت میں اب اسرائیل کی ملی بھگت بھی پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ اسرائیلی وزیراعظم کے حالیہ دورۂ بھارت کے بعد ہنود و یہود کا گٹھ جوڑ ہمارے خلاف سازشوں کے نئے جال پھیلائے گا، لیکن ان حالات میں بھی ہماری ملکی سیاست کی ابتری میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ عدالت عظمیٰ کے متوقع فیصلے سے قطع نظر بساط سیاست پر جو نقشہ جما ہوا ہے اس سے دو منظر ابھر سکتے ہیں، ایک یہ کہ ایوان صدر، اسٹیبلشمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں موجودہ مفاہمت برقرار رہے تو نواز شریف اور بے نظیر سیاسی عمل کو بچانے کے لئے آپس میں تعاون پر مجبور ہو جائیں گے اور مذہبی جماعتوں کا کردار آئندہ انتخابات میں نہ ہونے کے برابر ہوگا، بصورت دیگر صدر اسحاق کے محاذ سے کمزوری کا اظہار ہوا تو دو متحارب گروہ، نواز شریف اور بے نظیر کی سربراہی میں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوں گے اور نواز شریف مذہبی جماعتوں کا تعاون بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن اسلام کا اس بار بھی اتنا ہی بھلا ہوگا، جتنا پہلے ہوا۔

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بے نظیر کا یہ کہنا کہ ہمیں مودودی کا اسلام نہیں، اقبال کا اسلام چاہئے، عیاری اور منافقت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے بے نظیر کی سیاست کو بالعموم قدر کی نظر سے دیکھا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک اس میں کھلا کفر تو موجود تھا، منافقت نہ تھی، لیکن اقبال کے اسلام کو مودودی کے اسلام سے الگ کر کے بے نظیر نے ایک ایسا شوشہ چھوڑا ہے جو ہمیں خوفناک محاذ آرائی بلکہ خانہ جنگی تک لے جا سکتا ہے۔ اقبال اور مودودی کا اسلام ایک ہے اور اقبال نے اپنے انتقال سے ایک سال پہلے مولانا مودودی کو پنجاب میں بلا کر اسلام کا فکری محاذ ان کے سپرد کیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مولانا مودودی کی سیاست سے مجھے بھی اختلاف ہے لیکن ان کے فکر نے پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں احیائے اسلام کی تحریکوں کو جلا بخشی ہے اور ان کے فکر کی وارث ایک ایسی جماعت بھی پاکستان میں موجود ہے جس کے گرم خون کارکن مرنے مارنے پر تیار ہیں اور حال ہی میں افغانستان میں اس کی تربیت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ بے نظیر کو اسلام منظور نہیں اور یہ بات انہیں کھل کر کہنی چاہئے۔ انہیں اسلام کا علمبردار آخر سمجھا کس نے تھا جو وہ یہ وضاحت کرنے پر مجبور ہوئیں کہ ان کا اسلام اقبال والا ہے یا مودودی والا۔○○

——— لیکن سیاسی بحران ختم نہیں ہوا

لاہور ۲۸ مئی: تنظیم اسلامی کے امیر اور تحریک خلافت پاکستان کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد نے ملکی سیاست کے منظر میں واقع ہونے والی اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا ہے جس کا سبب عدالت عظمیٰ کا فیصلہ بنا تاہم ان کے تجزیے کے مطابق بحران ابھی ختم نہیں ہوا جس کا واحد سادہ حل نئے انتخابات کے ذریعے عوام سے نیا مینڈیٹ لینا ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عدالت عظمیٰ کے فیصلے نے ہماری عدلیہ کے وقار کو بلند کیا اور اس امید کو نئی زندگی بخشی ہے کہ قومی زندگی کے مشکل مرحلوں میں عدلیہ کے کردار پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ عدالتی فیصلے کی تنفیذ میں اگرچہ صدر مملکت نے بھی تعاون کیا تاہم فوج کا کردار مثالی رہا ہے اور انہی دو عوامل نے انتقال اقتدار کو تو اتنا آسان کر دیا کہ لمحوں میں کام مکمل ہو گیا اور کسی پیچیدگی کا سامنا نہیں ہوا لیکن وفاق کے ساتھ صوبوں کا تعلق پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ نازک صورت اختیار کر گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بحران ابھی ختم نہیں ہوا۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ چھوٹے صوبوں کی مرکز کے ساتھ تھوڑی بہت کشمکش پہلے بھی موجود تھی لیکن پنجاب کی صوبائی حکومت میں تبدیلیوں نے اس بحران کی شدت میں جو اضافہ کیا ہے اس کا مداوا صرف نئے عام انتخابات سے کیا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وطن عزیز کے دوسرے بہی خواہوں کی طرح میرا خیال بھی یہی ہے کہ ملکی سیاست کو نئے سرے سے صحت مند خطوط پر چلانے کے لئے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات اب بھی وقت کی ضرورت ہیں جو ایک خالص غیر سیاسی اور غیر جانبدار عبوری حکومت کی نگرانی میں فوج کے ذریعے کرائے جائیں۔ اس کے سوا جو بھی تدبیر کی گئی اس کے اثرات عارضی ثابت ہوں گے۔

پاکستان اسلامک فرنٹ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار نے کہا کہ قاضی حسین احمد جن مسائل کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں ان کی سنگینی سے کسی بھی باشعور شہری کو انکار نہیں۔ امریکی دباؤ کا مقابلہ اور جاگیرداروں سرمایہ داروں کی ملکی سیاست پر اجارہ داری کا خاتمہ واقعی ضروری ہے اور اس ضمن میں انہوں نے جو تیسری بات کہی اصولاً وہ بھی غلط نہیں۔ مذہبی جماعتوں کا اتحاد قائم کرنے کی بجائے مخلص اور اسلامی ذہن رکھنے والے کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ایک اچھی تجویز ہے کیونکہ جماعتوں کی قیادت کے سامنے ترجیحات مختلف ہوتی ہیں اور ان کے درمیان اتفاق رائے پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا جبکہ ایک عام کارکن کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار نے کہا کہ سوال اس پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ الیکشن کے ذریعے اقتدار میں آنے والی کوئی جماعت کیا یہ مقاصد حاصل کر بھی سکتی ہے۔ الیکشن میں کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہوتی ہے جب مروجہ نظام کے تقاضے پورے کئے جائیں۔ الجزائر کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار نے کہا کہ وہاں کے حالات بالکل جدا تھے۔ وہاں فرقہ واریت تو موجود تھی ہی نہیں اور جاگیرداری کو آزادی کے فوراً بعد سوشلسٹ حکومت نے ختم کر دیا تھا جبکہ ہمارے ہاں مذہبی جماعتیں قائم ہی فرقہ واریت کی بنیاد پر ہیں اور سیاست یہاں ہمیشہ جاگیرداروں کا کھیل رہی ہے۔